الیکساندر پشکن

ایوان بیلکن کی کہانیاں

Rs

روسی
کلاسیکی ادب
سلسلہ

А. ПУШКИН

ИЗДАТЕЛЬСТВО ЛИТЕРАТУРЫ НА ИНОСТРАННЫХ ЯЗЫКАХ
Москва

الیکساندر پشکن

بدیشی زبانوں کا اشاعت گھر
ماسکو

ترجمه: مجتبائی عباس

تصویرین از د ـ شمارینوف

ڈیزائین از س ـ پژارسکی

فہرست

صفحہ

عرض مؤلف ۱۱
نشانہ ۲۱
برفانی طوفان ٤۷
تابوت ساز ۷۳
گھوڑوں کی چوکی کا داروغہ ۸۹
بہروپ ۱۱۳
نوٹ ۱٤۹

مرحوم

ایوان پتروویچ

بیلکن کی کہانیاں

مؤلفہ

ا۔ پ

عصر مؤلف

مادام پروستاکووا:
«جی ہاں جناب! اسے بچوں تک
سے کہانیاں سننے کا شوق تھا ۔»

سکوتی‌نن:
«متروفان بالکل مجھ پر پڑا ہے ۔»

«کند ذھن» (۱)

ہم نے ا ۔ پ ۔ بیلکن کی کہانیاں شائع کرنے کا ارادہ کیا تو مناسب معلوم ہوا کہ پڑھنے والوں کے لئے مرحوم مصنف کا کچھ حال بطور پیش لفظ لکھدیں ۔ اس خیال سے ہم نے ماریا الکسیونا ترافیلنا سے مدد چاہی کیونکہ وہ ایوان پتروویچ بیلکن کی سب سے قریبی عزیز بھی ہیں اور ان کی جائداد کی وارث بھی ۔ بدقسمتی سے وہ ہمیں ان کے متعلق کچھ نہ بتا سکیں کیونکہ وہ مرحوم سے کبھی ملیں تک نہ تھیں ۔ مگر انہوں نے کہا کہ اگر ہم چاہیں تو ایک اور صاحب کی مدد لے سکتے ہیں جو ایوان پتروویچ کے دوست تھے ۔ ہم نے ان کی صلاح پر عمل کیا، جس کا نہایت تشفی بخش جواب ملا ۔ ہم رد و بدل کئے بغیر ذیل میں ان کا خط چھاپ رہے ہیں جو بیک وقت ایک شائستہ سمجھ بوجھ اور سچی دوستی کی بیش بہا یادگار بھی ہے اور مصنف کے سوانحی حالات کا مناسب تذکرہ بھی ۔

محترمی!

آپ کا پندرہ تاریخ کا لکھا ہوا عنایت‌نامہ مجھے تیئیس تاریخ کو ملا، جس میں آپ نے میرے عزیز دوست اور پڑوسی ایوان پتروویچ بیلکن مرحوم کی پیدائش، موت، نوکری، گھریلو زندگی، مشاغل اور کیریکٹر کے بارے میں تفصیلی معلومات مانگی ہیں۔ میں آپ کی خواہش حتی القدر پوری کرنے کی کوشش کرونگا کیونکہ مجھے خود اس سے بڑی خوشی اور آسودگی ہوگی۔ ان کی عادات اور فضائل اور گفتگو کے بارے میں مجھے جو کچھ یاد ہے نیز ان کے بارے میں اپنے کچھ خیالات بھی آپکو لکھ‌کر بھیج رہا ہوں۔

ایوان پتروویچ بیلکن ایک معزز گھرانے میں ۱۷۹۸ء میں گوریوھینو گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرحوم سیکنڈ میجر پیوتر ایوانووچ بیلکن نے ترافیلن خاندان کی لڑکی پیلاگیا گاوری‌لوونا سے شادی کی۔ وہ امیر تو نہ تھے مگر بڑے کفایت شعار اور معاملہ فہم تھے۔ ان کے بیٹے کی ابتدائی تعلیم گرجا کے محرر نے کی۔ اور اس لائق آدمی کے زیراثر انہیں مطالعہ کرنے اور اپنی مادری زبان میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۸۱۵ء میں ایوان پتروویچ بیلکن جاگر پیادہ فوج کی رجمنٹ (جس کا نمبر مجھے یاد نہیں رہا) میں بھرتی ہو گئے جس میں وہ ۱۸۲۳ء تک رہے۔ اس کے بعد انہیں ملازمت ترک کر دینی پڑی کیونکہ ان کے ماں باپ کا یکے بعد دیگرے تھوڑے تھوڑے وقفہ سے انتقال ہو گیا۔ اور انہیں اپنے گاؤں

گوریوھینو میں جاکر رھنا پڑا جو ان کی موروثی جاگیر میں واقع تھا۔

ایوان پتروویچ اپنے والد کی طرح سخت گیر اور اچھے منتظم نہ تھے۔ اسلئے جاگیر کا انتظام ھاتھہ میں لینے کے کچھہ ھی دنوں بعد ان کی ناتجربہ‌کاری اور نرم مزاجی کی وجہ سے اس کی حالت بہت ابتر ھو گئی۔ انہوں نے باپ کے وقت کے محنتی اور کارگذار مکھیا کو ھٹا دیا کیونکہ اس سے کسان اپنی عادت کے مطابق ناراض رھتے تھے۔ جائداد کا سارا انتظام انہوں نے اپنی پرانی مہتممہ خانہ کے سپرد کر دیا جس نے کہانیاں سنا سناکر ان پر اپنا سکہ جما رکھا تھا۔ یہ سادہ‌لوح بڑھیا پچاس اور پچیس روبل کے نوٹ میں تمیز نہ کر سکتی تھی۔ کسان اس سے ذرا بھی نہ ڈرتے تھے کیونکہ ان میں سے کتنوں کے بچوں کی وہ دینی ماں تھی۔ اس کی شہہ پاکر گاؤں والوں نے نیا مکھیا چنا جس نے کسانوں کے ساتھہ تو خوب رعائتیں کیں۔ بلکہ ان کے ساتھہ مل کر اپنے آقا کو دھوکہ دینے میں بھی دریغ نہ کیا۔ انجام یہ ھوا کہ ایوان پتروویچ کو بیگار کا دستور ترک کر دینا پڑا اور اس کی جگہ بہت ھی کم استثنا پر زمین چڑھانی پڑی۔ کسانوں نے زمیندار کی کمزور طبیعت سے فائدہ اٹھا کر پہلے سال چند اور رعائتیں بھی منظور کرا لیں۔ اور اگلے سال بھی لگان کا دو تہائی حصہ جنگلی اخروٹ، بلبیری اور اس قسم کی دوسری چیزوں کی شکل میں ادا کیا۔ بعض نے اس پر بھی پوری ادائیگی نہ کی۔

میں ایوان پتروویچ کے والد کا دوست تھا ۔ ان کو اچھی صلاح دینا میرا فرض تھا ۔ میں نے کئی بار چاہا کہ جائداد کی حالت سدھارنے میں ان کی کچھہ مدد کروں کیونکہ یہ کام اکیلے ان کے بس کا نہ تھا ۔ اس خیال سے میں ایک دن ان کے ہاں گیا ۔ حساب کتاب کے کھاتے منگائے، مکھیا بدمعاش کو بلوایا اور ایوان پتروویچ کے سامنے ہی پوچھہ گچھہ کرنے لگا ۔ شروع میں تو انہوں نے میری جانچ پڑتال پر بڑی سرگرمی اور توجہ کا اظہار کیا ۔ مگر جوں ہی معلوم ہوا کہ پچھلے دو سال میں گو مویشیوں، مرغیوں، بطخوں وغیرہ کی تعداد میں کمی ہوئی ہے مگر کسانوں کی آبادی میں اضافہ ہوا ہے تو وہ اس اطلاع سے اسقدر خوش ہوئے کہ انہیں اور کچھہ جاننے کی خواہش نہ رہی اور آخر میں جب میں نے مکھیا پاجی کو ایسا قائل کیا کہ وہ بغلیں جھانکنے لگا، اس وقت مجھے یہ دیکھکر انتہائی کوفت ہوئی کہ ایوان پتروویچ کرسی پر پڑے خراٹے لے رہے تھے ۔ اس دن سے میں نے ان کی جائداد کے معاملے میں دلچسپی لینی بالکل چھوڑ دی اور اس کو ایوان پتروویچ کی طرح خدا کے حوالے کر دیا ۔

مگر ان تمام باتوں سے ہم لوگوں کے دوستانہ تعلقات پر کچھہ اثر نہیں پڑا اگرچہ میں ان کی طبیعت کی کمزوری اور تباہ‌کن بے‌توجہی سے نالاں تھا جو آج کل کے شریف‌زادوں میں عام ہے ۔ مگر ان کی رحمدلی اور نیکی کی وجہ سے مجھے ایوان پتروویچ سے دلی لگاؤ تھا ۔ وہ بھی مجھے اپنا بزرگ مانتے تھے ۔ ہم لوگ تقریباً روزانہ ملتے تھے ۔ وہ

میری سیدھی سادھی گفتگو پسند کرتے تھے حالانکہ ہم لوگوں کی عادات، سوچ بچار کے طریقوں اور طبیعتوں کی افتاد میں کوئی مماثلت نہ تھی۔

ایوان پتروویچ کے مزاج میں اعتدال پسندی تھی۔ وہ کسی شوق میں حد سے تجاوز نہ کرتے۔ میں نے کبھی انہیں نشے میں دھت نہیں دیکھا (اور یہ بات ہمارے علاقے میں معجزے سے کم نہ تھی)۔ ضعف نازک ان کی خاص کمزوری تھی مگر ان کے معاملے میں بھی ان کے مزاج میں لڑکیوں کی سی جھجک تھی*۔

جن کہانیوں کا ذکر آپ نے اپنے خط میں کیا ہے ان کے علاوہ ایوان پتروویچ نے کچھ اور مسودے بھی چھوڑے ہیں، جن میں سے کچھ میرے قبضے میں ہیں اور کچھ ان کے گھر کی مہتممہ نے مختلف گھریلو کاموں میں استعمال کر لئے۔ مثلاً گھر کے جس حصے میں وہ رہتی ہیں، پچھلے جاڑوں میں اس کی سب کھڑکیوں پر ایک نامکمل ناول کے شروع کے اوراق چپکے ہوئے تھے... اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو مذکورہ بالا کہانیاں ایوان پتروویچ کی ابتدائی ادبی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔ ایوان پتروویچ کے بیان کے مطابق زیادہ تر کہانیاں سچی ہیں جن کے واقعات مختلف لوگوں نے ایوان پتروویچ کو

---

* اس جگہ خط میں ایک چھوٹا واقعہ بیان کیا گیا تھا جسے ہم نے فضول سمجھکر چھوڑ دیا۔ مگر پڑھنے والے یقین کریں کہ اس سے ایوان پتروویچ کی شخصیت کا کوئی برا پہلو نمایاں نہیں ہوتا تھا۔ (پشکن کا نوٹ)

بتائے تھے*۔ سب کہانیوں کے کرداروں کے نام فرضی ہیں۔ صرف گاؤں اور دیہات کے نام واقعی ہمارے علاقے کے ہیں۔ میرے گاؤں کا بھی ایک جگہ ذکر ہے۔ مگر اس کی وجہ کوئی بدنیتی نہ تھی، محض تخیل کی کمی سمجھئے۔

۱۸۲۸ء کی خزاں میں ایک بار سردی کھاکر ایوان پتروویچ سخت بیمار ہو گئے۔ اور مقامی ڈاکٹر کی انتہائی کوشش کے باوجود جانبر نہ ہو سکے حالانکہ ڈاکٹر بڑا ہوشیار تھا۔ پرانی بیماریوں مثلاً پاؤں میں گٹھے پڑ جانے کے علاج میں تو اس کا جواب نہ تھا۔ مگر موت کے آگے کسی کی کیا چل سکتی ہے؟ ایوان پتروویچ کا دم میری گود میں نکلا۔ عمر صرف تیس سال کی تھی۔ گوریوھینو گاؤں میں اپنے والدین کے قریب دفن ہوئے۔

ایوان پتروویچ کا قد درمیانہ، آنکھیں بھوری، بال سنہری، ناک سیدھی اور سبک، رنگت صاف اور جسم چھریرا تھا۔

---

* یہ واقعہ ہے کہ ا۔ پ۔ بیلکن کے مسودے میں ہر کہانی کے شروع میں مصنف کے قلم سے لکھا ہوا ہے «یہ کہانی مجھے فلاں شخص (اس کے نام کے شروع کے حروف، عہدے اور خطاب لکھے ہیں) سے معلوم ہوئی تھی۔ دلچسپی لینے والوں کی خاطر چند مثالیں درج ہیں۔ «گھوڑوں کی چوکی کا داروغہ» نام نہاد کاؤنسلر ا۔ گ۔ ن نے، «نشانہ» کرنل ا۔ ل۔ پ نے، «تابوت ساز» دکان کرمچاری ب۔ و نے اور «برفانی طوفان» اور «بہروپ» ایک نوجوان خاتون ک۔ ا۔ ت نے بتائی تھیں۔ (پشکن کا نوٹ)

اپنے دوست اور پڑوسی کی عادات، شکل و صورت اور مشاغل کے متعلق جو کچھہ مجھے یاد تھا سب آپ کو لکھہ دیا ہے۔ اگر آپ میرے خط کا کچھہ حصہ اشاعت کے لئے استعمال کریں تو اتنی عنایت کیجیئےگا کہ میرا نام نہ آنے پائے کیونکہ میں ادیبوں کی قدروعزت کرنے کے باوجود ان لوگوں میں شمار کیا جانا نہیں چاھتا اور نہ یہ میری عمر کے لئے موزوں ہی معلوم ھوتا ہے۔

زیادہ آداب

آپ کا نیازمند...

۱۶ نومبر ۱۸۳۰ء

موضع نینارادووا

مصنف کے دوست کی مرضی کے مطابق هم نے ان کا نام نہیں لکھا۔ مگر هم ان کے تہہ دل سے مشکور ھیں اور یقین ہے کہ همارے پڑھنے والے بھی ان کے خلوص اور سادگی کی قدر کریں گے۔

ا۔ پ۔

نشانہ

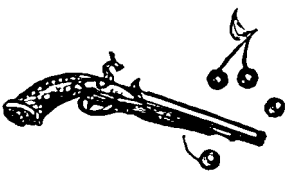

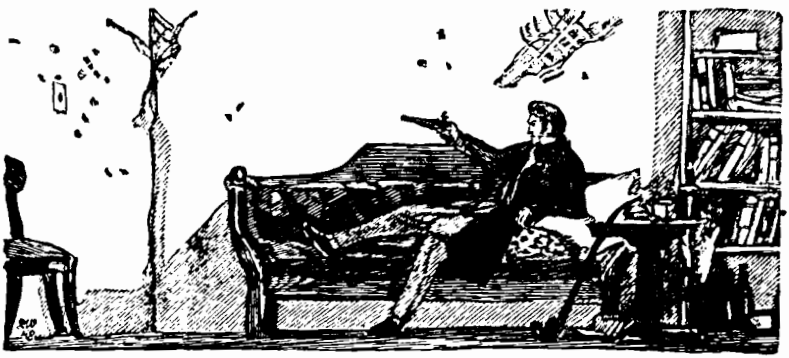

«هم نے ڈوئیل لڑی» (۲)

باراتینسکی

«میں نے قسم کھائی کہ ڈوئیل
کے حق کے مطابق اسے گولی
مار دونگا (میری ایک گولی
اس پر قرض تھی)»

«پڑاؤ کی شام» (۳)

— ۱ —

ہماری رجمنٹ کا پڑاؤ شہر «خ» میں تھا — سبھی جانتے ہیں کہ فوجی افسروں کی زندگی کس قسم کی ہوتی ہے — صبح کے وقت قواعد اور شہہ سواری، دو پہر کو رجمنٹ کمانڈر یا کسی یہودی کی دکان پر کھانا کھانا، شام کو تاش اور

شراب نوشی ۔ نہ شہر کے کسی گھرانے میں ہماری رسائی تھی نہ شہر بھر میں کوئی کم عمر ناکتخدا لڑکی تھی ۔ شام کو ایک دوسرے کی قیام‌گاہ پر ملتے تو ایک دوسرے کی وردیاں دیکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔

ہمارے دوستوں کے حلقے میں صرف ایک آدمی فوجی نہ تھا ۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی اس لئے ہم لوگ اسے کافی عمر رسیدہ سمجھتے تھے ۔ زندگی کے تجربہ نے اسے ہم لوگوں پر فوقیت دے دی تھی ۔ اس پر اس کی افسردہ طبیعت، کھرے مزاج اور تلخ کلامی کی عادت نے ہم نوجوانوں کو اور بھی مرعوب کر رکھا تھا ۔ اس کی زندگی سب کے لئے ایک راز سربستہ تھی ۔ وہ روسی معلوم ہوتا تھا مگر اس کا نام روسیوں جیسا نہ تھا ۔ ایک زمانے میں وہ فوجی رسالے میں سپاہی تھا، ترقی کی راہیں اس کے سامنے کھلیں تھیں کہ اچانک اس نے فوج سے استعفاء دے دیا ۔ اور آج تک کسی کو اس کی وجہ نہ معلوم ہو سکی ۔ پھر وہ اس چھوٹے سے گمنام شہر میں آ بسا ۔ اس کی زندگی عجب طور سے گذرتی تھی: ایک طرف غریبوں کی سی تنگدستی تھی اور دوسری طرف امیروں کی سی دریادلی ۔ مثلاً وہ سدا پھٹے پرانے فراک کوٹ میں بغیر سواری کے گھومتا مگر ہماری رجمنٹ کے افسروں کی خاطر تواضع کے لئے اس کے دروازے سدا کھلے رہتے ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے ہاں صرف دو یا تین قسم کے کھانے میز پر ہوتے تھے (پکانے والا بھی ایک سابق سپاہی تھا) مگر شامپین کے دور پر دور چلتے ۔ کسی

کو معلوم نہ تھا اس کی آمدنی کتنی تھی اور کہاں سے آتی تھی ۔ اور نہ کسی میں اتنی ہمت تھی کہ اس سے یہ سوال پوچھتا ۔ اس کے پاس کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ تھا جن میں زیادہ‌تر فن جنگ کے متعلق تھیں یا کچھ ناول تھے ۔ اپنی کتابیں وہ ہر ایک کو بخوشی دے دیتا اور کبھی واپسی کا مطالبہ نہ کرتا ۔ خود بھی کتاب لیکر واپس کرنے کا قائل نہ تھا ۔ اس کو لت تھی، تو ایک پستول سے نشانے بازی کی ۔ کمرے کی ہر دیوار گولیوں سے ایسی چھلنی ہو چکی تھی کہ اس پر شہد کی مکھیوں کے چھتے کا گمان ہوتا تھا ۔ اس کے کچے جھونپڑے میں سب سے بڑھیا چیز اس کے بیش قیمت پستول تھے ۔ نشانہ اس قدر بےخطا تھا کہ اگر وہ کسی کے سر پر رکھہ‌کر ناشپاتی کا نشانہ لگانا چاہتا تو اسکے لئے ہماری رجمنٹ کا ہر افسر بےجھجک اپنا سر پیش کر دیتا ۔ ہم لوگوں کی گفتگو میں اکثر ڈوئیل کا ذکر آتا ۔ مگر سلویو (میں اس کا تذکرہ اسی نام سے کرونگا) اس میں کبھی حصہ نہ لیتا بلکہ اگر کوئی پوچھتا بھی کہ اس نے کبھی ڈوئیل لڑی ہے تو وہ نہایت ترشی سے کہتا «ہاں» مگر اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو جاتا کہ وہ اس موضوع پر بات چیت بالکل پسند نہیں کرتا ۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو کوئی اس کے بےخطا نشانے کا شکار ہو چکا ہے جس کا اس کے ضمیر پر بوجھ ہے ۔ کسی کے ذہن میں بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس تذکرہ سے دامن بچانے کی وجہ بزدلی ہو سکتی ہے ۔ اصل میں بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے

ساتھہ ذہن میں بعض صفات کا تصور آ ہی نہیں سکتا ۔ اس لئے سلویو کو بزدل گردانتا ناممکن تھا ۔ مگر اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے ہم سب کو متحیر کر دیا ۔

ایک دن ہم دس افسر سلویو کے ہاں مدعو تھے ۔ حسب معمول شراب کا دور چل رہا تھا ۔ سب خوب پی پلا رہے تھے ۔ کھانا ختم ہونے پر ہم نے اپنے میزبان سے تاش کھیلنے اور بینکر بننے کی فرمائش کی ۔ پہلے تو اس نے انکار کیا کیونکہ وہ تاش بہت کم کھیلتا تھا ۔ مگر پھر اس نے تاش کے پتے منگوائے اور پچاس کے قریب دس دس روبل کے سکے میز پر پھیلاکر پتے بانٹنے شروع کر دئے ۔ سب نے اسے گھیر لیا اور کھیل شروع ہو گیا ۔ سلویو کی عادت تھی کہ تاش کھیلتے ہوئے بہت ہی خاموش رہتا، نہ کسی کی بات پر جرح کرتا، نہ اپنی صفائی پیش کرتا ۔ اگر کسی شرط بدنے والے سے کوئی غلطی ہو جاتی تو سلویو یا تو فوراً روپیہ ادا کر دیتا، یا رقم کاغذ پر لکھہ لیتا ۔ ہم سب اس کے ان اصولوں کو جانتے اور مانتے تھے ۔ مگر ہماری رجمنٹ میں ایک افسر نیا نیا آیا تھا ۔ کھیلتے ہوئے اس نے بےخیالی میں بازی کی شرح بڑھا دی ۔ سلویو نے چاک کے ٹکڑے سے عادت کے مطابق میزان صحیح کر دی ۔ افسر سمجھا کہ اس نے غلطی سے ایسا کیا ہے اور فوراً حجت شروع کر دی ۔ سلویو سنی ان سنی کرکے خاموشی کے ساتھہ کھیلتا رہا ۔ افسر کو تاب کا یارا نہ رہا ۔ اور اس نے سلویو کی تحریر کو برش سے مٹا دیا ۔ سلویو نے چاک اٹھاکر پھر وہی ہندسے لکھہ دئے ۔

جوئے اور شراب کی گرمی اور دوستوں کے قہقہوں سے کھسیاکر افسر اور بھی بھڑک اٹھا ۔ اس نے سلویو کے فعل کو اپنی ہتک سمجھا اور میز پر سے پیتل کا شمعدان اٹھاکر سلویو کی طرف تاک کر پھینکا ۔ مگر سلویو اس کی زد سے بال بال بچ گیا ۔ اس واقعہ سے ہم سب پریشان ہوگئے ۔ سلویو کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا ۔ آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں ۔ بڑی مشکل سے اپنے غصے کو ضبط کرکے اسنے اتنا کہا «جناب مہربانی سے اسی وقت یہاں سے تشریف لے جائیے ۔ اور اپنی خوش نصیبی پر شکر کیجئے کہ یہ واقعہ میرے گھر پر ہوا ۔»

اسی وقت سے ہم لوگ اپنے بدنصیب ساتھی کو مردوں میں گننے لگے کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ اس واقعہ کا انجام کیا ہوگا ۔ وہ فوراً یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا کہ وہ ہر وقت اس بےعزتی کا بدلہ چکانے کو تیار ہے ۔ اس کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر تک کھیل ہوتا رہا مگر سب نے محسوس کیا کہ ہمارے میزبان کا دل تاشوں میں نہیں لگ رہا ہے ۔ چنانچہ ایک ایک کرکے ہم سب وہاں سے رخصت ہو گئے ۔ راستے بھر یہی باتیں ہوتی رہیں کہ دیکھیں لیفٹیننٹ کی موت کے بعد اس کی جگہ کون آئے ۔

اگلے دن شہسواری کے اسکول میں سب ایک دوسرے سے لیفٹیننٹ کی خیر عافیت پوچھ رہے تھے کہ وہ خود ہی وہاں آ موجود ہوا ۔ ہم نے اس سے احوال پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ ابھی تک اس کے پاس سلویو کی طرف سے کوئی پیام

نہیں پہونچا ۔ سبھی کو اس پر بڑا اچنبھا ہوا ۔ وہاں سے ہم لوگ سلویو کے گھر گئے تو دیکھا وہ دروازے میں لگے ہوئے تاش کے اکے پر پے در پے گولی چلا رہا ہے ۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہم سب سے ملا ۔ ایک دن پہلے کے واقعہ کا ذکر تک نہ کیا ۔ اسی طرح تین دن اور گذر گئے ۔ لیفٹیننٹ زندہ سلامت موجود تھا ۔ ہر طرف یہی چرچا تھا کہ آخر بات کیا ہے ۔ شاید سلویو ڈوئیل لڑنا نہیں چاہتا ۔ اور ہوا بھی یہی ۔ لیفٹیننٹ نے معمولی سی معذرت کی اور سلویو نے اسے معاف کر دیا ۔

اس واقعہ کی وجہ سے ہم نوجوانوں کی نظر میں سلویو کی وقعت بہت کم ہو گئی ۔ کیونکہ ہماری عمر میں شجاعت اور بہادری کے اوصاف سب سے اعلیٰ معلوم ہوتے ہیں جن سے سب خامیوں کی پردہ‌پوشی کی جا سکتی ہے ۔ مگر رفتہ رفتہ یہ واقعہ بھولا بسرا ہو گیا ۔ اور سلویو کا اقتدار پھر ویسا ہی قائم ہو گیا ۔

صرف میرے دل میں سلویو کیطرف سے ہمیشہ کیلئے بال سا پڑ گیا ۔ ایک تو میں طبعاً رومان پسند تھا ۔ اس لئے اور سب افسروں سے زیادہ میں اس آدمی میں کشش محسوس کرتا تھا جس کی زندگی سب کے لئے ایک معمہ تھی ۔ مجھے وہ کسی پراسرار کہانی کا ہیرو معلوم ہوتا تھا ۔ اسے بھی اوروں کی نسبت مجھ سے زیادہ لگاؤ تھا کیونکہ صرف مجھ ہی سے وہ طنز آمیز فقرے‌بازی کے بغیر مختلف موضوعوں پر سادہ اور دلنشیں پیرایہ میں گفتگو کرتا تھا ۔ اس واقعہ

نے اسے میری نظروں سے گرا دیا ۔ رہ رہ کر یہ خیال مجھے ستاتا تھا کہ اس نے اپنی ہتک کا انتقام لینے سے کیوں گریز کیا ۔ اسی وجہ سے اس سے آنکھ ملاتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہونے لگی ۔ سلویو جہاندیدہ آدمی تھا ۔ میرے انداز سے میرے دلی جذبات بھانپ گیا ۔ لگتا تھا کہ اسے کافی تکلیف ہوئی ۔ ایک دو دفعہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہے ۔ مگر میں نے اس کا موقع نہ دیا ۔ اور اس سے اکیلے میں ملنے سے کترانے لگا ۔ بعد میں سلویو نے بھی مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ۔ اب میں صرف اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں اس سے ملتا اور ہماری پہلے کی پرخلوص صحبتیں بالکل ختم ہو گئیں ۔

بڑے بڑے شہروں کے آرام و آسائش کے عادی لوگ ان احساسات کی لذت کو کیا جانیں جو گاؤں اور قصبوں والوں کی زندگی میں اسقدر اہمیت رکھتے ہیں مثلاً ڈاک کا انتظار : منگل اور جمعہ کے دن رجمنٹ کا ہیڈ کوارٹر افسروں کے مجمع سے کھچا کھچ بھر جاتا ۔ کوئی روپئے آنے کی امید لگائے ہوئے ہے، کوئی خطوں کے لئے بے چین ہے، کوئی اخبار اور رسالوں کا انتظار کر رہا ہے ۔ مارے بے صبری کے اکثر خط وہیں کھول کر پڑھ لئے جاتے ۔ ایک دوسرے کو خبریں سنائی جاتیں ۔ غرض یہ کہ ہر طرف عجب چہل پہل نظر آتی ۔ سلویو کے خطوط بھی رجمنٹ کی معرفت آتے تھے ۔ اس لئے ڈاک کے دن وہ بھی وہیں موجود ہوتا ۔ ایک دفعہ اس کے نام کا ایک خط اسے دیا گیا ۔ اس نے بڑی بے صبری

سے اس کی مہر توڑی۔ خط کے مضمون پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ سب افسر اسوقت اپنے اپنے خط پڑھنے میں اتنے منہمک تھے کہ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اتنے میں اس نے خود ہی سب کو مخاطب کرکے کہا «حضرات! بعض حالات کی وجہ سے میری یہاں سے فوری روانگی ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سب آج آخری بار میرے ساتھہ کھانا کھانے سے انکار نہ کرینگے۔ میں آپ سب کا منتظر رہونگا۔» پھر میری طرف دیکھکر کہا کہ «تم ضرور آنا۔» یہ کہکر وہ تیزی سے ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے نکل گیا۔ ہم لوگ بھی سلویو کے ہاں ایک دوسرے سے ملنے کا وعدہ کرکے اپنی اپنی قیام‌گاہ پر چلے آئے۔

میں مقررہ وقت پر سلویو کے ہاں پہونچا تو تقریباً پوری رجمنٹ وہاں موجود تھی۔ سلویو کا سب سامان بندھا ہوا رکھا ہوا تھا اور ہر طرف گولیوں سے چھلنی خالی دیواروں کے سوا کچھہ نظر نہ آتا تھا۔ ہم لوگ کھانے کی میز کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ ہمارے میزبان کی طبیعت اسوقت بہت ہی حاضر تھی۔ اس کی زندہدلی نے ہم پر بھی اثر کیا۔ ہر طرف بوتلوں کے کاگ اڑنے لگے۔ گلاسوں میں شراب سنسنانے لگی اور ہم سب اپنے جدا ہونے والے دوست کی کامیابی اور سلامتی کے لئے جام پر جام خالی کرنے لگے۔ اسی طرح ساری شام گذر گئی۔ اندھیرا بڑھہ جانے پر ہم لوگ اٹھے اور اپنی اپنی ٹوپیاں پہننے لگے۔ سلویو نے ہر ایک سے ہاتھہ ملایا۔ میری باری آئی تو اس نے میرا ہاتھہ

دباکر آهستگی سے کہا «مجھے تم سے بات کرنی ہے» ۔ میں جاتے جاتے رک گیا ۔

یکے بعد دیگرے سب مہمان رخصت ہو گئے ۔ صرف ہم دونوں رہ گئے ۔ ہم نے اپنے اپنے پائپ سلگا لئے ۔ سلویو اندر ہی اندر کسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا ۔ شام کی زندہ دلی کا شائبہ تک باقی نہ تھا ۔ چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی ۔ آنکھوں میں غیر قدرتی چمک تھی ۔ پائپ کے سیاہ دھوئیں کے مرغولوں میں گھر کر وہ کوئی ڈراؤنی مخلوق ہو رہا تھا ۔ چند منٹ اور گذر گئے ۔ تب سلویو نے خاموشی کی زنجیر توڑی «کیا خبر آج کے بعد ہم دونوں کبھی نہ مل سکیں ۔ اس لئے روانگی سے پہلے میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا ۔ یہ تو تمہیں پتہ ہی ہے کہ میں کسی کی رائے کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتا مگر تم مجھے پسند ہو ۔ اور تم میرے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا رہے تو مجھے تکلیف ہوگی ۔»

وہ رکا اور اپنے پائپ میں تمباکو بھرنے لگا ۔ میں چپ چاپ زمین کی طرف تکتا رہا ۔

«تمہیں یقیناً تعجب ہوگا کہ میں نے اس دن اس شراب کے نشے میں چور شیخی‌خورے لونڈے سے اپنی ہتک کا بدلہ کیوں نہیں لیا؟ حالانکہ اسوقت اس کی زندگی میرے ہاتھ میں تھی ۔ اور چونکہ مجھے ہتھیار چننے کا حق تھا اس لئے مجھے کسی قسم کا خطرہ بھی نہ تھا ۔ اگر چاہوں تو تمہیں اس غلط فہمی میں ڈال سکتا ہوں کہ اس دن کا عفو اور درگذر میری عالی ظرفی کی دلیل تھی ۔ مگر میں تمہیں دھوکہ دینا نہیں

چاھتا ۔ اگر میں اپنی زندگی کو بالکل خطرے میں ڈالے بغیر اسے سزا دے سکتا تو ھرگز معاف نہ کرتا ۔»

اس اعتراف سے میں بالکل حیرانِ اور ششدر رھہ گیا ۔ مگر سلویو اس طرح اپنی دھن میں بولتا چلا گیا ۔

«ھاں میں اپنی زندگی کو کسی خطرے میں ڈالنے کا مجاز نہیں ۔ چھہ سال پہلے ایک شخص نے میرے منہ پر طمانچہ مارا تھا ۔ اور میرا وہ دشمن آج تک زندہ ھے ۔ اس ھتک کا بدلہ چکانے سے پہلے میں اپنی زندگی کو کسی قسم کے خطرے میں نہیں ڈال سکتا ۔»

میرے دل میں تجسس کا جذبہ بیدار ھو گیا ۔ «تو کیا اس وقت تم اس سے ڈوئیل نہیں لڑے تھے؟» میں نے پوچھا ۔ «یا شائد کسی وجہ سے تمہیں لڑے بغیر ھی وھاں سے چلا آنا پڑا؟»

«میں اس سے ڈوئیل لڑا تھا» سلویو نے جواب دیا ۔ «اس کی یادگار ابھی تک میرے پاس محفوظ ھے ۔»

وہ اٹھا اور گتے کے ڈبے میں سے ایک سرخ کا مدار فوجی ٹوپی نکالی جس میں گلٹ کا پھندنا لٹک رھا تھا ۔ اس نے ٹوپی سر پر رکھی تو میں نے دیکھا ماتھے سے انچ بھر اوپر گولی کا آر پار نشان تھا ۔

سلویو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ھوئے کہا «تمہیں شائد معلوم ھو کہ میں ایک زمانے میں «ن» رجمنٹ میں تھا ۔ تم میری طبیعت کی افتاد سے واقف ھو کہ میں ھر بات میں سب سے آگے رھنا چاھتا ھوں ۔ جوانی میں یہ دھن جنون کی

حد تک پہونچی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں فتنہ اور فساد روزمرہ کی بات تھی۔ اور میں فوج میں فسادیوں کا سرغنہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم لوگ بدمستی اور بدھوشی پر فخر کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک دفعہ مشہور شرابی بورتسوف کو بھی مات دے دی تھی۔ بورتسوف وہی شرابی ہے جس کو شاعر دنیس داویدوف (٤) نے اپنے شعروں میں امر کر دیا ہے۔ ہماری رجمنٹ میں آئے دن ڈوئیل ہوتے رہتے تھے اور شائد ہی کوئی ڈوئیل ایسا ہوتا ہو جس میں میرا کچھہ دخل نہ ہو۔ میرے ساتھیوں نے مجھے آسمان پر چڑھا رکھا تھا۔ لیکن رجمنٹ کے کمانڈر میرے وجود کو بلائے بیدرماں سمجھتے تھے۔

یوں میں بڑے ٹھاٹھہ سے شہرت اور ہردلعزیزی کا لطف اٹھا رہا تھا کہ ہماری رجمنٹ میں ایک نیا افسر بھرتی ہوکر آیا۔ وہ ایک اعلی خاندان کا فرد تھا۔ میں نے آجتک اس جیسا نصیبہ‌ور آدمی نہیں دیکھا۔ جوانی اور ذہانت، خوبروئی اور جوانمردی، شہرت اور ناموری غرض کونسی چیز تھی جو اس کے حصے میں نہ آئی تھی؟ وہ روپیہ یوں پانی کی طرح بہاتا جیسے اس کے پاس قارون کا خزانہ ہو۔ تم خود ہی سوچ لو کہ ایسے آدمی سے سب کس قدر مرعوب ہوئے ہونگے۔ میرے اقبال کا ستارہ غروب ہونے لگا۔ شروع شروع میں اس نے میری شہرت سنکر مجھہ سے دوستی کرنی چاہی۔ مگر میں نے اس کی دوستانہ پیشکش کو ایسی سرد مہری سے ٹھکرایا کہ اس دن سے وہ بھی مجھہ سے بےاعتنائی برتنے لگا۔ مجھے

اس سے انتہائی رقابت اور نفرت ہو گئی۔ رجمنٹ کے افسروں ور عورتوں میں اس کی کامیابی مجھے ایک آنکھ نہ بھائی۔ میں ہر جگہہ اسے چڑانے اور جھگڑا بڑھانے کی کوشش کرتا۔ اس پر فقرے چست کرتا جن کا وہ ایسا دندان‌شکن جواب دیتا کہ میں کٹ کر رہ جاتا۔ اس کے جملے بذلہ‌سنجی اور ظرافت کی چاشنی سے پر لطف ہوتے اور میرے طنز کے زہر میں بجھے ہوئے۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ ہم سب ایک پولش جاگیردار کے ہاں محفل رقص میں مدعو تھے۔ سب خواتین پروانوں کی طرح اس پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ میرے دل میں حسد کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ گھر کی مالکہ بھی (جو پہلے مجھہ سے معاشقہ لڑا رہی تھی) اسی کی طرف مائل تھی۔ مجھہ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے اس کے کان میں ایک نہایت بےہودہ فقرہ کہا جسے سنکر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے چٹاخ سے میرے گال پر طمانچہ مارا۔ دونوں طرف میان سے تلواریں نکل آئیں۔ خواتین مارے خوف کے بےہوش ہو گئیں۔ بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرکے لوگوں نے ہمیں علیحدہ کیا۔ اسی رات کو ہم دونوں میں ڈوئیل ہونا قرار پایا۔

اگلی صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی میں مع اپنے تینوں ساتھیوں کے مقررہ مقام پر پہونچ گیا اور اپنے حریف کا بےچینی سے انتظار کرنے لگا۔ بہار کا موسم تھا۔ سورج سویرے سے نکل آیا تھا۔ گرمی ہو چلی تھی۔ میں نے دور سے اسکو آتے ہوئے دیکھہ لیا۔ وہ پیدل آ رہا تھا۔ وردی تلوار پر لٹکی ہوئی ہاتھہ میں تھی۔ اور صرف ایک آدمی

ساتھہ تھا ۔ ہم اس سے ملنے بڑھے تو وہ ٹوپی ہاتھہ میں لئے بڑی بےفکری کے ساتھہ آگے آیا ۔ ٹوپی میں سرخ سرخ چیری بھری تھی ۔ ہمارے ساتھیوں نے بارہ بارہ قدم کا فاصلہ ہم دونوں کے درمیان ناپا ۔ مجھے پہلے گولی چلانے کا حق تھا ۔ مگر میں غصہ سے اس قدر لرز رہا تھا کہ مجھے اپنے ہاتھہ پر بھروسہ نہ تھا ۔ اس لئے میں نے اسے پہلے گولی چلانے کا موقعہ دیا ۔ وہ اس پر راضی نہ ہوا ۔ آخر قرعہ ڈالنے کا فیصلہ ہوا ۔ وہ سدا ہی سے تقدیر کا منظور نظر تھا ۔ قرعہ بھی اسی کے نام نکلا ۔ اس نے نشانہ لگایا اور گولی میری ٹوپی کو پارکر گئی ۔ اب اس کی زندگی میرے ہاتھہ میں تھی ۔ میں نے اس کے آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں تاکہ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کی پرچھائیں دیکھہ سکوں ۔ مگر وہ اسی طرح لاپرواہی سے میرے پستول کی طرف منہ کئے ہوئے کھڑا رہا ۔ اور ٹوپی میں سے پکی پکی چیری چن کر کھاتا اور ان کی گٹھلیاں میری طرف تھوکتا رہا ۔ میں نے سوچا «ایسے آدمی کو مارنے سے کیا حاصل جسے اپنی جان کی اتنی کم پرواہ ہو ۔» اور پھر اسی لمحہ ایک اور شیطانی خیال میرے دل میں آیا ۔ میں نے پستول والا ہاتھہ نیچے گرا دیا ۔

چنانچہ میں نے کہا «اس وقت آپ بہت ہی مصروف نظر آ رہے ہیں ۔ آپ کا دھیان ڈوئیل میں نہیں ہے ۔ میں بھی آپ کی دلچسپ مشغلے چیری کھانے میں مخل ہونا نہیں چاہتا ۔» «نہیں، نہیں آپ میری ذرا فکر نہ کریں ۔ آپ میرے

مشغلے میں ذرا بھی خلل نہیں ڈال رہے ہیں۔ گولی چلائیے۔ خیر اگر اسوقت آپ کی طبیعت حاضر نہیں ہے تو پھر سہی مجھ پر آپ کا قرض رہا۔ جب آپ چاہیں میں چکا دونگا» اس نے جواب دیا۔ میں اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا اور کہا کہ میں اسوقت گولی چلانا نہیں چاہتا۔ اور یہ معاملہ اس وقت یوں ختم ہو گیا۔

میں نے فوج سے استعفاء دیدیا اور اس گمنام گوشہ میں آ بسا۔ مگر تب سے آج تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب میرے دل میں انتقام کے شعلے دھیمے پڑے ہوں۔ بس یہی ایک خاش، یہی ایک خیال میری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ اور آخر آج وہ دن آگیا جس کا مجھے اتنی مدت سے انتظار تھا۔

ساویو نے اپنی جیب سے وہ خط نکالا جو اس دن صبح اس کو ملا تھا اور مجھے پڑھنے کو دیا۔ غالباً اس کے وکیل نے ماسکو سے لکھا تھا کہ ایک خاص شخص بہت جلد ایک حسین اور نوجوان لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔

سلویو نے کہا «یہ تو تم سمجھ ہی گئے ہونگے کہ یہ خبر کس شخص کے متعلق ہے۔ میں ابھی ماسکو جا رہا ہوں۔ اب دیکھنا ہے کہ وہ اپنی شادی کی شام کو بھی موت کا اسی لا پرواہی سے استقبال کرتا ہے جیسا ایک دفعہ پہلے چیری کھاتے ہوئے کیا تھا۔»

یہ کہکر وہ اٹھا، ٹوپی سر سے زمین پر پٹخ دی اور پنجرے میں بند شیر کی طرح ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ میں دم

بخود کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا ۔ دل میں عجب متضاد جذبات چکر لگا رہے تھے ۔

اتنے میں نوکر نے آکر کہا کہ گھوڑے تیار ہیں ۔ سلویو نے میرا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا ۔ ہم دونوں گلے ملے اور وہ گاڑی میں بیٹھ گیا جس میں دو ٹرنک رکھے تھے، ایک میں اس کے پستول تھے اور دوسرے میں باقی سارا سامان تھا ۔ ہم دونوں نے ایک بار پھر خدا حافظ کہا اور گاڑی روانہ ہو گئی ۔

— ۲ —

کئی برس اور گذر گئے ۔ نجی حالات کی وجہ سے مجھے ایک بہت پس‌ماندہ گاؤں میں جو ضلع «ن» میں واقع تھا سکونت اختیار کرنی پڑی ۔ یہاں مجھے اپنی جائیداد کا سارا انتظام کرنا پڑتا تھا ۔ میں مستقل اپنی پرانی آزاد اور بےفکری زندگی کو یاد کرکے آنسو بہایا کرتا تھا ۔ خاص طور پر خزاں اور جاڑے کے موسم میں تنہائی کی شامیں کاٹے نہ کٹتی تھیں ۔ سہ پہر کے کھانے تک تو کسی نہ کسی طرح وقت گذر جاتا تھا ۔ کبھی گاؤں کے نمبردار سے باتیں کرتا، کبھی جاگیر کا دورہ کرکے دیکھتا کہ کام کیسا ہو رہا ہے یا جو نئے کام شروع کرائے ہیں وہ کس ڈھنگ سے چل رہے ہیں ۔ مگر اندھیرا ہوتے ہی دل گھبرانے لگتا ۔ گھر کے گودام اور الماریوں میں جتنی کتابیں نظر پڑی تھیں انہیں بار بار پڑھ چکا تھا ۔ بوڑھی منتظمہ کری‌لوونا کو جتنی کہانیاں یاد تھیں وہ کئی دفعہ مجھے سنا چکی تھی ۔ گاؤں کی عورتوں کے گانوں کی

آواز سن‌کر مجھہ پر عجب اداسی طاری ہو جاتی۔ ممکن تھا کہ میں شراب کا عادی ہو جاتا۔ مگر زیادہ شراب پینے سے سر میں شدید درد ہونے لگتا۔ دوسرے یہ کہ بیکاری اور اکتاہٹ سے گھبرا کر شراب نوشی کرنے سے مجھے سخت چڑ تھی۔ ہمارے علاقہ میں اس قسم کے تباہ حال شرابیوں کی کمی نہ تھی جو زندگی کے خلا کو شراب کے نشے سے پر کرنا چاہتے تھے۔ میرے دو تین ہمسائے انہیں بدنصیبوں میں سے تھے۔ ان کی گفتگو میں کھنکھنارنے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے کے سوا کچھہ نہ ہوتا۔ خدا بچائے ایسے لوگوں کی محبت سے، ان سے ملنے سے تو تنہائی غنیمت ہے۔

ہمارے یہاں سے چار کوس پرے کاؤنٹس «ب» کی جاگیر تھی جہاں صرف ان کی جائیداد کا منتظم رہتا تھا۔ کاؤنٹس وہاں صرف ایک بار شادی کے فوراً بعد مہینے بھر کے لئے آئی تھیں مگر مجھے آئے سال بھر ہوا تھا کہ سنا گیا کہ کاؤنٹس اور ان کے شوہر گرمی میں اپنے علاقہ پر آئینگے اور جون کے آغاز میں وہ لوگ سچ مچ آگئے۔

دیہات میں رہنےوالوں کے لئے کسی دولت مند پڑوسی کا آنا ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ آس پاس کے جاگیرداروں اور ان کے لواحقین میں ان کی آمد کا تذکرہ دو ماہ پہلے سے شروع ہوتا ہے اور تین سال تک ختم نہیں ہوتا۔ ہمسائے میں ایک حسین اور نوجوان خاتون کے آنے کی خوش خبری نے خود مجھہ پر بھی بہت اثر کیا۔ مجھے اسکو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ ان کو وہاں پہنچے ہفتہ بھر ہوا ہوگا۔ اتوار

کا دن تھا کہ میں کھانے کے بعد اپنے معزز پڑوسیوں سے تعارف اور نیاز حاصل کرنے «س» گاؤں کی طرف چل پڑا۔

چوبدار نے مجھے کاؤنٹ کے درالمطالعہ میں پہنچا دیا اور خود میرے آنے کی اطلاع دینے اندر چلا گیا۔ یہ وسیع کمرہ بہت نفاست کے ساتھہ انتہائی قیمتی سامان سے آراستہ تھا۔ کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں دیواروں سے لگی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کے اوپر کانسی کے بت سجے ہوئے تھے۔ سنگ مرمر کے آتش خانے پر قد آدم شیشہ لگا ہوا تھا۔ فرش پر سبز کپڑا بچھا ہوا تھا جس پر قالین اور نمدے پڑے ہوئے تھے۔ اتنے عرصے تک اپنے کونے پر پڑے رہنے کے بعد اس آرائش و زیبائش کو دیکھکر میں بالکل مرعوب ہو گیا۔ اور کاؤنٹ کا انتظار ایسے اضطرابی انداز میں کرنے لگا جیسے کوئی دیہاتی امیدوار شہر میں وزیر کی آمد کا منتظر ہو۔ دروازہ کھلا اور ایک بتیس سالہ خوشرو شخص داخل ہوا، اس کے انداز میں پرخلوص سادگی تھی۔ میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنا تعارف کرانا چاہا۔ مگر کاؤنٹ نے خود سبقت کی اور ہم بیٹھہ گئے۔ تنہائی میں رہتے رہتے میری طبعیت میں جھجک سی پیدا ہو گئی تھی جو اس کی شائستہ اور بےتکلف گفتگو سے کچھہ ہی دیر میں غائب ہو گئی۔ عین اسی وقت کاؤنٹس داخل ہوئی اور مجھہ پر دوبارہ گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ وہ نہایت حسین و جمیل تھی۔ کاؤنٹ نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ میں چاہتا تھا کہ میری بدحواسی ظاہر نہ ہونے پائے مگر نا کام رہا۔

میری حالت کا اندازہ لگاکر ان دونوں نے آپس میں بات چیت شروع کر دی گویا میں ان کا پرانا واقف ہوں جس کے سامنے رسمی تکلف غیرضروری ہے۔ میں اپنے حواسوں پر قابو پانے کے لئے کمرے میں ادھر ادھر گھوم کر لٹکی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا۔ تصویروں کے متعلق میرا علم بہت ہی واجبی ہے۔ مگر ایک تصویر پر میری نگاہ جم‌کر رہ گئی۔ یہ تصویر سوئیزرلینڈ کے ایک حسین منظر کی نقاشی تھی۔ مگر مجھے اس میں کوئی فنی دلچسپی نہ تھی۔ میری تمام‌تر توجہ گولی کے ان دو نشانوں پر مرکوز تھی جو تصویر میں ایک دوسرے کے عین اوپر نیچے تھے۔ میں نے کاؤنٹ کو مخاطب کرکے کہا «افوہ یہ کسقدر غضب کا نشانہ ہے۔» «واقعی کمال کا ہے» اس نے مجھ سے اتفاق کیا، پھر پوچھا «آپ کا نشانہ کیسا ہے؟» «نمبر ایک» میں نے جواب دیا اور خوش تھا کہ میرے پسندیدہ موضوع پر بات چیت چھڑ گئی۔ «میں تیس قدم سے تاش کے پتے پر نشانہ لگا سکتا ہوں بشرطیکہ پستول میرا اپنا ہو۔» «سچ مچ؟» کاؤنٹس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ پھر اس نے اپنے شوہر سے محبت بھرنے انداز میں پوچھا «کیا تم بھی تیس قدم سے بےچوک نشانہ لگا سکتے ہو؟» «کسی دن آزمائش کرنی چاہئے» کاؤنٹ نے جواب دیا۔ «کسی زمانے میں میرا نشانہ برا نہ تھا مگر پچھلے چار سال سے میں نے پستول کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔» «تب تو میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ سرکار بیس قدم سے بھی تاش کے پتے پر نشانہ نہیں لگا سکتے۔ اچھی نشانہ بازی کے لئے روزمرہ کی مشق نہایت لازمی ہے۔»

اور یہ میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں۔ مجھے رجمنٹ کے بہترین نشانہ بازوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ میرے پستول مرمت کے لئے گئے ہوئے تھے۔ میں مہینے بھر تک مشق نہ کر سکا، اس کے بعد جو میں نے پہلے دن گولی چلائی تو یقین کیجئے پچیس قدم کے فاصلے سے بوتل کا نشانہ خطا کر گیا۔ ہمارا کپتان جو بڑا ظریف اور فقرہ باز تھا کہنے لگا «ارے یار ہٹاؤ تم شراب کی بوتل کا نشانہ بنانے کی بدمذاقی نہیں کر سکتے۔» سرکار کو بھی اس معاملے میں غفلت نہیں برتنی چاہئے ورنہ مشق بالکل چھوٹ جائیگی۔ میں نے تو صرف ایک آدمی کا سو فیصدی بےخطا نشانہ دیکھا تھا اور وہ روز مرہ بلا ناغہ مشق کیا کرتا تھا۔ کھانے سے پہلے کم از کم تین بار اس کے لئے نشانہ بازی ایسے ہی لازمی تھی جیسے کھانے سے پہلے وودکا * کا گلاس۔» کاؤنٹ اور کاؤنٹس خوش تھے کہ میری زبان کا قفل ٹوٹا۔ کاؤنٹ نے کہا: «اس شخص کے نشانے کے متعلق کچھ اور بتائیے۔» «سرکار کیا بتاؤں کبھی کبھار تو ایسا ہوتا کہ وہ دیوار پر مکھی کو بیٹھا دیکھتا... آپ ہنس رہی ہیں بیگم صاحبہ مگر میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بالکل سچ ہے، میں قسم کھا سکتا ہوں... ہاں تو وہ مکھی کو دیکھکر کہتا: لانا کزکا میرا پستول! کزکا بھرا ہوا پستول لاتا۔ ٹھائیں! اور مکھی دیوار پر ہی پس جاتی۔» «واقعی کمال تھا! کیا نام تھا اس شخص کا؟» «سلویو۔» «سلویو!!!» کاؤنٹ تعجب سے اچھل پڑا۔ «کیا تم سلویو کو

* وودکا: نہایت تند روسی شراب۔ (مترجم)

جانتے تھے؟» «جی ہاں، جی ہاں ہم دونوں تو بڑے گہرے دوست تھے۔ ہماری رجمنٹ میں تو سب اس سے اس طرح پیش آتے تھے گویا وہ ہم ہی میں سے ایک ہو۔ مگر پانچ برس ہونے کو آئے کہ مجھے اس کی کوئی خیر خبر معلوم نہیں ہوئی... کیا عالی جاہ بھی سلویو کو جانتے تھے؟» «میں؟ ہاں میں اسے خوب اچھی طرح جانتا تھا... کیا اس نے کبھی تمہیں؟.. مگر یہ بات نا ممکن سی ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے ایک غیرمعمولی واقعہ کا کسی سے ذکر کیا ہو۔» «کیا سرکار اس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جب ایک سر پھرے نوجوان نے اس کے طمانچہ رسید کیا تھا؟» «کیا اس نے تمہیں اس نوجوان کا نام نہیں بتایا؟» «نہیں سرکار۔» اور اچانک مجھ پر حقیقت کا انکشاف ہو گیا۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا «اوہ۔ معاف کیجئے... میرا مطلب تھا... مجھے بالکل اندازہ نہ تھا... وہ آپ تھے کیا؟» «ہاں» کاؤنٹ کے چہرے پر کرب کی کیفیت تھی۔ «اور یہ تصویر میری اور سلویو کی آخری ملاقات کی یادگار ہے۔» کاؤنٹس نے کہا «اف! اس واقعہ کو مت دہراؤ، تم تو جانتے ہو کہ اس کی یاد میرے لئے کسقدر تکلیف دہ ہے۔» «مگر میں ضرور بتاؤنگا۔ اگر یہ جانتے ہیں کہ میں نے ان کے دوست کی کس طرح بےعزتی کی تھی تو انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ سلویو نے کس طرح مجھ سے اپنا انتقام لیا۔» اس نے میرے لئے ایک آرام کرسی گھسیٹ دی اور میں ہمہ تن گوش ہو کر یہ قصہ سننے لگا۔

«میری شادی کو پانچ سال ہوئے ہیں ۔ ہم نے اپنا ہنی‌مون کا مہینہ یہیں دیہات میں بسر کیا تھا ۔ میری زندگی کے سب سے پرمسرت دن یہیں گذرے ہیں اور زندگی کی سب سے المناک یاد بھی اسی جگہ سے وابستہ ہے ۔

«ایک شام ہم دونوں میاں بیوی گھوڑوں پر سوار سیر کے لئے جا رہے تھے ۔ راستے میں میری بیوی کا گھوڑا بدکنے لگا ۔ وہ ڈر گئی اور گھوڑے کی باگ مجھے پکڑا کر خود پیدل گھر کی طرف روانہ ہو گئی ۔ میں گھوڑے پر سوار آگے نکل گیا ۔ گھر کے قریب پہنچکر میں نے دیکھا کہ احاطہ میں ایک گاڑی کھڑی ہے ۔ نوکر نے بتایا کہ کوئی صاحب مطالعہ کے کمرے میں میرا انتظار کر رہے ہیں ۔ مگر انہوں نے اپنا نام بتانے سے انکار کر دیا ہے، صرف اتنا کہا ہے کہ ضروری کام ہے ۔ میں اندر گیا تو شام کے دھندلکے میں ایک آدمی نظر آیا ۔ سفر کی گرد میں اٹا ہوا، حجامت بڑھی ہوئی، وہ آتشدان کے سامنے عین اس جگہ کھڑا تھا ۔ میں قریب جاکر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا ۔ «کیا تم مجھے نہیں پہچانتے کاؤنٹ؟» اس نے مرتعش آواز میں پوچھا ۔ «سلویوا» میرے منہ سے نکلا ۔ یقین مانئے اسے پہچان کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ «بالکل ٹھیک پہچانا تم نے ۔ اب میری باری ہے گولی چلانے کی ۔ میں اپنا پستول خالی کرنے آیا ہوں، کہو تیار ہو؟» اس کی اوپر کی جیب میں سے پستول کی نالی نظر آ رہی تھی ۔ میں نے بارہ قدم ناپے اور اس کونے میں کھڑا ہو گیا اور اس سے جلدی کرنے کو کہا تاکہ میری بیوی کے

وہاں پہونچنے سے پہلے قضیہ چک جائے۔ مگر وہ دیر لگاتا رہا۔ پہلے روشنی لانے کو کہا۔ خیر شمعیں لائی گئیں۔ میں نے کمرہ اندر سے مقفل کر لیا کہ چاہے کچھ ہو کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ اور پھر اس سے پستول چلانے کو کہا۔ اس نے پستول نکال کر نشانہ باندھا... میں گھڑیاں گن رہا تھا۔ بیوی کا خیال دل کو مسوس رہا تھا۔ اف بیم و ہراس کا وہ ایک لمحہ کسقدر خوفناک تھا... سلویو کا ہاتھہ نیچے گر گیا اور اس نے کہا «افسوس میرے پستول میں چیری کی گٹھلیاں نہیں ہیں اور گولیاں بہت بھاری ہوتی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں ڈوئیل نہیں لڑ رہا ہوں قتل کر رہا ہوں۔ کیونکہ نہتے آدمی پر گولی چلانا میرا شیوہ نہیں۔ اسلئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ڈوئیل نئے سرے سے لڑیں اور قرعہ ڈالیں کہ پہلے کون گولی چلائے۔» میرا سر چکرا رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے اس کی یہ تجویز رد کر دی مگر پھر نہ جانے کیسے ایک اور پستول بھرا گیا، دو کاغذ کی پرچیوں پر کچھہ لکھہ کر انہیں توڑ موڑ کر اسی ٹوپی میں ڈالا گیا جسے میں نے ایکدن نشانہ بنایا تھا۔ اس دفعہ بھی قرعہ میرے ہی نام نکلا۔ اس نے ایسے زہر خند کے ساتھہ جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا کہا۔ «کاؤنٹ تمہاری قسمت تو شیطان سے بھی اچھی ہے۔» آج تک میری سمجھہ میں نہیں آیا کہ اس نے مجھے کیونکر آمادہ کیا اور یہ سب کیسے ہوا کہ میں نے گولی چلا دی جو اس تصویر پر جاکر لگی۔» (کاؤنٹ نے گولی کے نشانوں والی

تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، کاؤنٹس کا چہرہ اس کے شال سے زیادہ سفید تھا ۔ میرے منہ سے اضطراری چیخ نکل گئی ۔)

«میں نے گولی چلائی» کاؤنٹ نے اپنی داستان جاری رکھی «اور شکر ہے کہ میرا نشانہ خطا ہو گیا ۔ اب سلویو نے شست باندھی، اس کا چہرہ اسوقت انتہائی غضبناک تھا ۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا اور ماشا اندر گھس آئی اور چیخیں مارتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی ۔ اسے دیکھکر میرا دماغ جو اتنی دیر سے ماؤف تھا پھر کام کرنے لگا ۔ میں نے اطمینان کا لہجہ بناکر اس سے کہا «پیاری تم دیکھتی نہیں ہم لوگ مذاق کر رہے ہیں ۔ ذرا دیکھو تو تم نے اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے، جاؤ جاکر پانی وانی پئیو پھر یہاں آنا ۔ میں تمہیں اپنے پرانے عزیز دوست سے ملانا چاہتا ہوں ۔» ماشا کو میری بات کا یقین نہیں آیا ۔ «کیا میرے شوہر ٹھیک کہہ رہے ہیں؟» ماشا نے ہمت کرکے سلویو سے پوچھا ۔ «کیا سچ مچ آپ دونوں مذاق کر رہے ہیں؟» «یہ تو سدا مذاق ہی کرتے رہتے ہیں، کاؤنٹس ۔ ایک دفعہ مذاق ہی مذاق میں انہوں نے میرے منہ پر طمانچہ رسید کر دیا تھا ۔ پھر انہوں نے مذاق میں میری ٹوپی کا نشانہ بنایا ۔ اور ابھی مذاق میں پھر ان کا نشانہ چوک گیا... اب ذرا میرا بھی مذاق کرنے کو دل چاہ رہا ہے ۔» یہ کہکر اس نے ماشا کے سامنے ہی پھر میری طرف نشانہ باندھنے کی کوشش کی... ماشا اس کے قدموں پر گر پڑی ۔ میں بے اختیار چلایا «ماشا! یہ کیا کر رہی ہو، شرم نہیں آتی، اٹھو! اور

جناب ایک بےبس اور بدنصیب عورت کا مذاق اڑانا کونسی مردانگی ہے؟ آپ گولی چلائینگے یا نہیں؟» «نہیں» سلویو نے کہا ۔ «میں نے تمہارے چہرے پر خوف و ہراس کی جھلک دیکھ لی ۔ تم نے مجھ پر دوسری بار گولی بھی چلا لی ۔ اب مجھے تسکین ہوگئی ۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اب تم مجھے کبھی نہ بھول سکوگے ۔ تمہارا فیصلہ تمہارے ضمیر پر چھوڑتا ہوں ۔» یہ کہکر وہ جانے کے لئے مڑا مگر دروازہ میں رک کر اس نے تصویر کی طرف دیکھا جس پر میری گولی کا نشانہ لگا تھا ۔ اور تقریباً بغیر نشانہ باندھے اس نے لبلبی دباکر گولی چلا دی اور غائب ہو گیا ۔ گولی کی آواز سن کر میری بیوی بےہوش ہوگئی ۔ نوکر اس واقعہ سے اسقدر سراسیمہ تھے کہ کسی کو سلویو کو روکنے کی جرأت نہ ہوئی ۔ اس نے برساتی میں پہونچکر اپنے سائیس کو آواز دی اور قبل اس کے میرے حواس ٹھکانے ہوں وہ جا چکا تھا ۔»

کاؤنٹ چپ ہو گیا اور یوں مجھے اس عجیب و غریب کہانی کا انجام معلوم ہوا جس کے آغاز نے مجھے اسقدر متاثر کیا تھا ۔ میں اس کہانی کے ہیرو سے پھر کبھی نہ مل سکا ۔ مگر کہا جاتا ہے کہ سلویو نے الیکساندر اپسلانتی (۵) کی بغاوت میں ایک فوجی دستے کی رہنمائی کی اور اسکولیانی کی لڑائی میں مارا گیا ۔

برفانی طوفان

گھوڑے ناھموار زمین پر برف کو ٹاپوں سے
روندتے بجلی کی سی تیزی سے اڑے جا رھے
ھیں...
کہ اچانک تنہائی اور سناٹے میں سے
خدا کا گھر نمودار ھوتا ھے۔
. . . . . .
برف و باد کا طوفان، دم کے دم میں، ھر
شے کو رو پہلی چادر سے ڈھانک لیتا
ھے۔ برف کے گالے رقص کرتے ھوئے گر
رھے ھیں۔
واھمہ کا خیالی کوا پر پھڑپھڑا کر
ھچکولے کھاتی ھوئی برف گاڑی پر
جھپٹتا ھے، اس کی منحوس چیخ ھول
میں اور اضافہ کر رھی ھے۔
برق رفتار گھوڑے یاس کے دھندلکے
میں منزل کو تکتے ھیں۔
اور ان کے جسم بخوف سے لرزاں
ھیں... (٦)

ژوکوفسکی

ھماری تاریخ کا ناقابل فراموش دور تھا۔ ١٨١١ء کے اختتام کا ذکر ھے کہ معزز گاوریلا گاوریلووچ اپنی جاگیر نیناراداوا

میں رہتے تھے۔ علاقہ بھر میں ان کی رحم‌دلی اور مہمان‌نوازی کا چرچا تھا۔ ان کے قریبی پڑوسی اکثر ان کے ہاں آتے رہتے تھے، بعض کھانے پینے کے شوق میں، بعض ان کی بیوی کے ساتھ پانچ کوپک کی بازی لگا کر بوسٹن کھیلنے کے لئے، اور بعض ان کی بیٹی ماریا گاوریلوونا کے شوق دیدار میں۔ اس سترہ سالہ نازک اندام دوشیزہ کے بہت سے امیدوار تھے، لوگ جانتے تھے کہ وہ ایک امیر دلہن ثابت ہوگی۔ کوئی خود شادی کرنا چاہتا تھا اور کوئی اپنے بیٹے سے اس کی شادی کا خواہشمند تھا۔

ماریا گاوریلوونا بچپن سے رومانی فرانسیسی ناول پڑھ پڑھ کر پلی تھی۔ لہذا عشق میں مبتلا تھی۔ اس کا محبوب ایک غریب اور ادنی فوجی افسر تھا جو چھٹیاں گذارنے اپنے آبائی گاؤں میں آیا ہوا تھا۔ عشق کی آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ لیکن جونہی ماریا کے والدین کو اس دو طرفہ رجحان کا پتہ چلا، انہوں نے بڑی سختی سے اپنی بیٹی کو اس نوجوان کا خیال تک دل سے نکال دینے کا حکم دیا۔ اور نوجوان سے ان کا برتاؤ اس قدر سرد مہری کا ہو گیا گویا وہ محکمۂ آبکاری کا ریٹائرڈ مجسٹریٹ ہو۔

اس پر بھی یہ محبت کے دیوانے کسی نہ کسی طرح خط و کتابت کرتے رہے۔ اور ہر روز صنوبر کے جھنڈ کی سنسان چھاؤں میں یا ایک پرانے گرجا میں چھپ چھپ کر ملتے رہے جہاں وہ ابدی محبت کے عہد و پیمان باندھتے۔ کبھی اپنی بدنصیبی پر آنسو بہاتے، کبھی آئندہ کے لئے تجویزیں سوچتے۔ ان روز روز کی ملاقاتوں اور خط و کتابت کا یہ انجام ہوا کہ

دونوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں جی سکتے۔ اور اگر بےرحم والدین کو ان کی خوشی کا کچھہ خیال نہیں تو وہ بھی ان کی رضامندی کی پرواہ کیوں کریں؟ یہ خیال پہلے تو نوجوان عاشق کے ذہن میں آیا مگر بعد میں رومان پسند ماریا گاوریلوونا نے بھی قبول کر لیا۔

سردی کا موسم آتے ہی ان کی خفیہ ملاقاتیں تو ختم ہو گئیں مگر خط و کتابت میں اور بھی گرمجوشی پیدا ہو گئی۔ ولادیمیر نیکولائےوچ ہر خط میں اپنی محبوبہ سے التجا کرتا کہ وہ اس کے ساتھہ خفیہ شادی کرکے ہمیشہ کے لئے اس کی ہو جائے۔ کچھہ دنوں پوشیدہ رہنے کے بعد وہ دونوں ماریا کے والدین کے قدموں پر سر رکھہ کر معافی مانگ لیں‌گے۔ اور یقین ہے کہ ان کا دل بھی ان باوفا عاشقوں کی بہادری اور مصیبتوں کے خیال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہےگا۔ وہ یقیناً انہیں اپنی شفقت بھری آغوش میں پناہ دے دیں‌گے۔

شروع میں ماریا گاوریلوونا کو یہ تجویز قبول کرنے میں کافی ہچکچاہٹ تھی۔ بھاگنے کی کتنی ہی تجویزیں پیش ہوئیں اور مسترد ہو گئیں۔ مگر آخرکار وہ بھی راضی ہو گئی۔ طے یہ پایا کہ فرار ہونے کے دن وہ کھانے پر نہ جائے اور سر کے درد کا بہانہ کرکے کمرے میں لیٹی رہے۔ اپنی ایک خادمہ کو شریک راز بنالے۔ رات گئے دونوں لڑکیاں پچھلی طرف سے باغ میں اتر جائیں جہاں ان کو برف گاڑی تیار ملےگی۔ اس میں بیٹھہ کر وہ نیناردووا سے پانچ کوس دور

ژادرینو کے گاؤں میں پہنچ کر سیدھی گرجا گھر کے سامنے جا اتریں۔ وہاں ولادیمیر ان کا منتظر ہوگا۔

بھاگنے سے ایک دن پہلے ماریا گاوریلوونا رات بھر نہ سوئی۔ کچھہ دیر تو ساتھہ لیجانے کے لئے کپڑے وغیرہ رکھتی رہی، پھر ایک طویل درد بھرا خط اپنی ایک جذباتی سہیلی کے نام لکھا۔ ایک اور خط اپنے والدین کو لکھا جس میں اس نے نہایت پراثر انداز میں ان سے رخصت چاہی اور لکھا کہ جذبۂ عشق سے مجبور ہوکر یہ قدم اٹھا رہی ہوں۔ لیکن سچی خوشی مجھے اس وقت ہوگی جب آپ مجھے معاف کرکے اپنے قدموں پر سر جھکانے کی اجازت دیں‌گے۔ پھر اس نے دونوں خطوں پر شہر تولا کی بنی ہوئی مہر لگائی جس پر ایک با موقع تحریر کے اوپر دو بھڑکتے ہوئے دل کندہ تھے، دن نکلنے سے پہلے وہ نڈھال ہوکر بستر پر گر پڑی اور کچھہ دیر کو اس کی آنکھہ جھپک گئی۔ مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ڈراؤنے خواب دیکھکر چونک اٹھتی۔ کبھی دیکھتی کہ گرجا جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے اس کا باپ عین وقت پر آ جاتا ہے اور اسے ایک اتھاہ تاریک غار میں پھینک دیتا ہے، وہ نہایت تیزی سے نیچے کی طرف گرتی جا رہی ہے اور جیسے اس کے دل کی حرکت بند ہونے کو ہے۔ دوسری دفعہ سوئی تو اس نے ولادیمیر کو خون میں شرابور نیم جان گھاس پر پڑے دیکھا۔ مرتے مرتے وہ بڑے دلخراش لہجے میں شادی میں جلدی کرنے کی التجا کرتا ہے۔ اس طرح کے بےربط خوفناک ہیولے خواب میں اس کی نگاہوں کے سامنے سے گذرتے رہے۔

آخر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ اور سر میں سچ مچ درد شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کی حالت دیکھکر متفکر ہو گئے۔ اور بہت محبت سے پوچھا۔ «ماشا، کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟» ان کی دل جوئی دل پر برچھی کی طرح لگی۔ اس نے چاہا کہ ان کی فکر دور کرنے کو چہرے پر خوشی پیدا کر سکے۔ مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ شام ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں اس خیال سے ہوک اٹھ رہی تھی کہ خاندان والوں کی محبت بھری آغوش میں یہ اس کی آخری شام ہے اس کا دم جیسے گھٹ رہا تھا۔ دل ہی دل میں اس نے گھر کے ہر فرد کو، اپنی جانی پہچانی ہر چیز کو الوداع کہا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور ماں باپ کو شب بخیر کہا۔ انہوں نے حسب معمول پیار کیا اور دعائیں دیں۔ ماریا کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ بڑی مشکل سے کمرے تک پہنچی اور دروازہ بند کرتے ہی کرسی پر بےقابو ہوکر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خادمہ نے اسے تسلی تشفی دی۔ جانے کی سب تیاریاں مکمل تھیں، آدھہ گھنٹے بعد ماشا اپنے والدین کے گھر، اپنے کمرے، اپنی بچپن کی الھڑ اور بےفکر زندگی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے والی تھی۔ باہر طوفانی برفباری ہو رہی تھی۔ ہوا غرا رہی تھی، جھلملیاں چرچرا رہی تھیں، اسے یہ سب چیزیں کسی بدشگونی کی علامتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ کچھہ دیر میں سارا گھر نیند کے جادو میں مدہوش ہو گیا۔ ماشا نے سر پر شال اوڑھی، گرم لبادہ

لپیٹا، اپنے زیور کا صندوقچہ اٹھایا اور پچھلے دروازے سے باہر نکل آئی۔ پیچھے پیچھے خادمہ ہاتھ میں دو پارسل اٹھائے تھی۔ دونوں باغ میں پہنچیں۔ طوفان کی تیزی میں ذرا کمی نہ ہوئی تھی، منہ پر ہوا کے تھپیڑے نوعمر مجرم کو گناہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ غرض وہ بمشکل باغ کے دوسرے سرے تک پہنچیں۔ سڑک پر سلج ان کے انتظار میں کھڑی تھی۔ گھوڑے سردی سے شل ہو چکے تھے اور دوڑنے کے لئے بیقرار ہوکر ٹاپیں مار رہے تھے۔ ولادیمیر کا کوچوان گاڑی کے بموں کے سامنے ٹہل رہا تھا تاکہ کسی طرح جوشیلے گھوڑوں کو قابو میں رکھ سکے۔ اس نے سہارا دےکر ماریا اور اس کی خادمہ کو گاڑی میں بٹھایا۔ بنڈل اور صندوقچہ اندر رکھا۔ لگامیں تھامتے ہی گھوڑے سڑک پر سرپٹ دوڑنے لگے۔اب ہیروئن کو قسمت اور کوچوان تریشکا کی مہارت کے سپرد کرکے ہم نوجوان عاشق کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں۔

ولادیمیر دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ صبح کو پہلے تو زادرینو کے پادری صاحب کے پاس گیا اور ان کو بڑی مشکل سے شادی کی رسم ادا کرنے پر راضی کیا۔ پھر وہ گواہوں کی تلاش میں آس پاس کے زمینداروں کے ہاں جانے کے ارادہ سے نکلا۔ سب سے پہلے وہ دراون نامی ایک چالیس سالہ ریٹائرڈ عہدیدار کے ہاں گیا جو فوراً گواہی دینے پر راضی ہو گیا۔ اور کہنے لگا کہ اس تذکرے سے مجھے پرانے زمانے کی فوجی زندگی کی ہنگامہ خیزیاں یاد آ گئیں۔ اس

نے ولادیمیر کو کچھہ دیر ٹھہرنے اور اپنے ساتھہ کھانا کھانے کی دعوت بھی دی اور یقین دلایا کہ اسے بقیہ دو گواہ بھی باسانی مل جائیں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔ کھانے کے فوراً بعد انسپکٹر اراضی شمت مونچھیں چڑھائے، مہمیز لگائے، قصبہ کے پولس انسپکٹر کے بیٹے کی ہمراہ داخل ہوئے۔ یہ نوجوان جس نے عمر کی سولہ بہاریں دیکھی تھیں حال ہی میں الانز کی رجمنٹ میں بھرتی ہوا تھا۔ جب انہوں نے ولادیمیر کی درخواست سنی تو نہ صرف وہ خوشی سے گواہ بننے پر راضی ہو گئے بلکہ یہاں تک کہا کہ وہ اس کی خاطر جان تک دینے میں دریغ نہ کریں گے۔ ولادیمیر جوش و خروش کے ساتھہ ان سے گلے ملا اور خوش خوش باقی تیاریاں کرنے اپنے گھر چلدیا۔

شام کا دھندلکا چھا چکا تھا۔ اس نے اپنی تین گھوڑوں کی گاڑی اپنے معتمد تریشکا کے ساتھہ مکمل ہدایات دےکر نیناراددوا روانہ کی اور خود اپنی چھوٹی ایک گھوڑے کی برف گاڑی لیکر ژادرینو کی طرف روانہ ہو گیا جہاں دو گھنٹے بعد ماریا گاوریلوونا کے آنے کی امید تھی۔ راستہ اس کا جانا بوجھا تھا۔ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں وہ منزل مقصود تک پہنچ سکتا تھا۔

لیکن ولادیمیر گاؤں سے باہر نکلا ہی تھا کہ ہوا میں تندی پیدا ہو گئی اور برفانی طوفان نے وہ شدت اختیار کی کہ ولادیمیر کو کچھہ نظر نہ آتا تھا۔ منٹ بھر میں سڑک پر برف کی تہ بچھہ گئی اور ارد گرد کی سب چیزیں ایک بےنور پیلے دھندلکے میں ڈوب گئیں جس میں برف کے سفید گالے تیر

رہے تھے ۔ زمین اور آسمان مل کر ایک ہو گئے ۔ اتنے میں ولادیمیر کو احساس ہوا کہ اس کی گاڑی کسی کھیت میں گھس گئی ہے، اس نے دوبارہ سڑک پر گاڑی ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا ۔ گھوڑا کسی نا معلوم سمت میں اڑا چلا جا رہا تھا ۔ کبھی برف کے تودوں میں جا پھنستا، کبھی کسی گڑھے میں بھٹک جاتا ۔ ہر لمحہ گاڑی الٹ جاتی تھی ۔ ولادیمیر کی تمامتر کوشش یہی تھی کہ راستے کا سراغ نہ کھو جائے ۔ اسی حالت میں (اس کے خیال میں) اسے آدھہ گھنٹہ گذر گیا ۔ مگر وہ ژادرینو کے جنگل تک نہ پہنچ سکا ۔ دس منٹ اور گذر گئے ۔ لیکن پھر بھی درختوں کا جھنڈ نہ دکھائی دیا ۔ اب وہ ایک ایسے کھلے میدان میں جا پہنچا تھا جسے گہری گھاٹیوں نے آڑا ترچھا کاٹ رکھا تھا ۔ طوفان اسی شدت سے جاری تھا ۔ آسمان بادلوں سے چھپا ہوا تھا ۔ گھوڑا تھک چکا تھا ۔ اور ولادیمیر برف میں کمر تک دھنسا ہوا ہونے کے باوجود پسینے میں شرابور تھا ۔

بہت دیر بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ بالکل غلط طرف جا رہا ہے ۔ اس نے لگام ڈھیلی چھوڑ دی اور اندازہ کرنا چاہا کہ وہ کس طرف ہے اور اب اسے کدھر مڑنا چاہئے ۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اسے دائیں ہاتھ کی طرف مڑنا چاہئے تھا ۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اسی طرف چل پڑا ۔ گھوڑا بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا ۔ اسی طرح راستے پر ایک گھنٹے سے زیادہ گذر گیا ۔ اور اس نے سوچا کہ اب ژادرینو زیادہ دور نہ ہوگا ۔ وہ آگے ہی بڑھتا چلا گیا مگر معلوم ہوتا تھا کہ ان کھیتوں کا

کہیں اختتام ہی نہیں ہے ۔ ہر طرف برف کے انبار اور گھاٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا ۔ ہر قدم پر گاڑی الٹ الٹ جاتی تھی اور ولادیمیر ہر بار گاڑی کو ٹھیک اور سیدھا کرتا تھا ۔ وقت گذرتا گیا ۔ ولادیمیر کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی ۔

بہت دیر بعد اسے افق پر ایک سیاہ دھبہ نظر آیا ۔ ولادیمیر نے فوراً گھوڑے کا رخ ادھر موڑ دیا ۔ نزدیک آیا تو اسے ایک جنگل دکھائی دیا ۔ اس نے یہ سمجھ کر کہ اب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچ گیا ہے، خدا کا شکر ادا کیا، گھوڑے کو تیز کیا تاکہ جلد از جلد جنگل کو پار کرکے دوسری طرف جانی پہچانی سڑک پر پہنچ جائے جہاں سے وہ بھٹک گیا تھا ۔ اسی سڑک کے دوسری طرف ژادرینو تھا ۔ چند منٹ میں وہ سڑک پر پہنچ گیا ۔ گاڑی موسم سرما کے بےبرگ و بار درختوں کے اداس سایوں کے نیچے چلنے لگی ۔ یہاں ہوا کا زور کم تھا ۔ سڑک ہموار تھی ۔ گھوڑے میں بھی کچھ دم آ گیا تھا ۔ اور ولادیمیر کے حواس بھی کچھ درست ہوئے ۔

وہ یونہی بڑھتا گیا ۔ مگر حد نظر تک ژادرینو کا کوئی پتہ نہ تھا ۔ جنگل کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتا تھا ۔ پر تھوڑی دیر بعد اسے اس خیال سے وحشت ہونے لگتی کہ اب وہ کسی اور انجانے جنگل میں بھٹک گیا ہے ۔ پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں اس نے گھوڑے کو بے تحاشا مارنا شروع کیا ۔ بےچارہ گھوڑا پہلے تو بوکھلا کر سرپٹ بھاگا مگر پندرہ منٹ بعد تھک کر پھر قدم قدم چلنے لگا ۔ اور پھر مصیبت زدہ

ولادیمیر کی انتہائی کوشش پر بھی اس کی رفتار میں چستی پیدا نہ ہوئی۔

رفتہ رفتہ گھنا جنگل چھٹ گیا۔ مگر جب ولادیمیر باہر نکلا تو بھی ژادرینو نظر نہ آیا۔ اسے یقین تھا کہ آدھی رات ہو چکی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے اندھا دھند گاڑی چلانی شروع کردی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ بادل اڑ گئے تھے۔ حد نظر تک سفید برف سے ڈھکا ہوا میدان لہریں لے رہا تھا۔ رات خاصی روشن تھی۔ دفعتاً ذرا فاصلے پر اسے ایک چھوٹی سی بستی نظر آئی۔ گھوڑے کو تیز کرکے اس کے قریب پہنچا۔ اور پہلے جھونپڑے کے قریب گاڑی سے کود پڑا اور کھڑکی کا پٹ دھڑ دھڑانے لگا۔ منٹ بھر بعد چوبی جھلملی کھلی اور ایک بوڑھے آدمی نے سفید داڑھی باہر نکال کر جھانکا۔ «کیا کام ہے؟» «کیا ژادرینو یہاں سے بہت دور ہے؟» «نہیں زیادہ دور نہیں ہے، کوئی دس کوس ہوگا۔» یہ سن کر ولادیمیر نے اپنے سر کے بال نوچ لئے۔ اس وقت اس کی حالت اس آدمی کی سی تھی جس نے سزائے موت کا حکم سنا ہو۔

«تم کہاں سے آ رہے ہو؟» مگر ولادیمیر کی جواب دینے کی طاقت گویا سلب ہو چکی تھی۔ «بڑے میاں کیا مجھے ژادرینو تک جانے کے لئے گھوڑا مل سکتا ہے؟» «اجی، ہمارے ہاں کیا گھوڑے بندھے ہوئے ہیں؟» «اچھا کوئی مجھے وہاں کا راستہ دکھا سکتا ہے؟ میں اسے منہ مانگا انعام دوں گا۔» «ایک منٹ ٹھیرو» اس نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ «میں

اپنے بیٹے کو بھیجتا ہوں۔ وہ تمہیں راستہ بتا دے گا۔» ولادیمیر انتظار کرنے لگا۔ لیکن اسے ایک ایک منٹ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے پھر کھڑکی پر ہاتھ مارا۔ کھڑکی کھلی اور وہی سفید داڑھی دوبارہ نمودار ہوئی۔ «کیا ہے؟» «تمہارا بیٹا کہاں رہ گیا؟» «ابھی آتا ہے۔ ذرا جوتے پہن رہا ہے۔ اندر آ جاؤ۔ اگر سردی لگ رہی ہو تو آگ تاپ لو۔» «نہیں، نہیں مجھے بہت جلدی ہے۔ اپنے بیٹے کو بھیجو جلدی سے۔»

دروازہ چرچرایا اور ایک نوجوان لڑکا سونٹا ہاتھ میں لئے باہر نکلا اور آگے آگے چلنے لگا۔ کبھی وہ اشارے سے راستہ دکھاتا، کبھی رک کر راستے کا کھوج لگاتا کیونکہ برف نے سب نشانات مٹا دئے تھے۔ ولادیمیر نے اس سے وقت پوچھا۔ «صبح ہونے والی ہے» وہ بولا۔ یہ سنتے ہی ولادیمیر کی زبان گنگ ہو گئی۔

جب وہ ژادرینو پہنچے تو مرغ بانگ دے رہے تھے۔ پوپھٹ چکی تھی۔ گرجا کے دروازے میں تالا پڑا تھا۔ ولادیمیر نے رہبر کو انعام دیا۔ اور پادری کے گھر کی طرف چل پڑا۔ مگر گاڑی وہاں بھی نہ تھی۔ پتہ نہیں آگے کیا ہونے والا تھا!

اب ہم نیناردووا کے مکینوں کی طرف لوٹتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

مگر وہاں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔

لوگ حسب معمول اٹھے۔ ماریا کے معمر والدین روز کے معمول کے مطابق ڈرائنگ روم میں جاکر بیٹھ گئے۔ گاوریلا

گاوریلووچ شب خوابی کی ٹوپی اور فلالین کی واسکٹ پہنے ہوئے تھے۔ اور پراسکوویا پتروونا روئی کے فرغل میں ملبوس تھیں۔ سماوار کمرے میں لاکر رکھا گیا۔ گاوریلا گاوریلووچ نے ایک خادمہ سے کہا کہ جاکر ماریا گاوریلوونا کی طبیعت پوچھے اور معلوم کرے کہ ان کو رات کو کیسی نیند آئی؟ خادمہ ذرا دیر بعد واپس آئی اور کہنے لگی کہ «بی‌بی کو نیند تو اچھی طرح نہیں آئی مگر طبیعت بہتر ہے۔ وہ ابھی نیچے آ رہی ہیں۔» اسی وقت دروازہ کھلا اور ماریا گاوریلوونا نے داخل ہو کر اپنے والدین کو سلام کیا۔

«ماشا تمہارے سر کا درد اب کیسا ہے؟» گاوریلا گاوریلووچ نے پوچھا۔ «بہتر ہے پاپا» اس نے جواب دیا۔ «کل دیر تک آتشدان کے پاس بیٹھے رہنے سے سر میں درد ہوا ہوگا» پراسکوویا پتروونا نے کہا۔ «شاید یہی بات ہو، اماں» ماشا نے کہا۔

دن بخیر و خوبی گذر گیا۔ مگر رات کو ماشا بیمار پڑ گئی۔ قریب کے قصبے سے ڈاکٹر کو بلوایا گیا جو اگلے دن شام ہوئے وہاں پہنچا۔ اس وقت تک ماشا کی سرسامی کیفیت ہو چکی تھی۔ بخار بہت تیز تھا۔ غریب لڑکی دو ہفتے تک موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہی۔

گھر میں کسی کو اس کے فرار ہونے کا علم نہ تھا۔ ماشا نے جانے سے پہلے جو خط لکھے تھے واپسی پر جلا دئے۔ ماشا کی خادمہ نے اپنے آقا کے ڈر سے کسی کے سامنے ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا۔ پادری، ریٹائرڈشدہ فوجی عہدیدار،

مونچھوں والا انسپکٹر اراضی اور نوجوان فوجی سبھی اپنی اپنی مصلحتوں سے خاموش تھے یہاں تک کہ سائیس تریشکا کے منہ سے بھی کبھی کوئی بات نہ نکلی، نشے کی حالت میں بھی نہیں ۔ اور اس طرح یہ راز جس میں چھہ سات آدمی شامل تھے راز ہی رہا ۔ لیکن ماریا گاوریلوونا نے اپنی طویل ہذیانی حالت میں خود ہی یہ راز اگل دیا ۔ مگر اس کی باتیں اتنی نا قابل فہم تھیں کہ اس کی ماں جو دن رات اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی تھیں صرف اتنا سمجھ سکیں کہ ان کی بیٹی ولادیمیر نیکولائیوچ سے بےتحاشا محبت کرتی ہے اور شاید یہ محبت ہی اس کی بیماری کی جڑ ہے ۔ اس نے اس بات کا اپنے شوہر سے ذکر کیا ۔ انہوں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا اور سب کی یہی رائے ہوئی کہ شاید لڑکی کی قسمت میں یہی لکھا ہے اور تقدیر کے لکھے سے کوئی مفر نہیں ۔ انہوں نے اپنے دل کو یہ کہکر بھی سمجھایا کہ مفلسی کوئی جرم نہیں اور زندگی روپیوں کی تھیلی کے ساتھہ نہیں گنواری جاتی بلکہ انسان کی رفاقت میں بسر ہوتی ہے ۔ غرض اس قسم کے اور سب فرسودہ قول دھرائے گئے جو ایسے موقعوں پر کام آتے ہیں جب ہم اپنے فیصلوں کی اور کوئی توجیہہ نہیں کر سکتے ۔

اسی دوران میں لڑکی رفتہ رفتہ صحتیاب ہونے لگی ۔ ولادیمیر بہت عرصے سے گاوریلا گاوریلووچ کے ہاں نہ آیا تھا کیونکہ وہ ان لوگوں کے برتاؤ سے کافی خائف ہو چکا تھا ۔ اب اسے ایک دن خاص طور پر بلایا گیا اور ماشا سے شادی کی غیر متوقع خوش خبری سنائی گئی ۔ نیناراڈووا کے مالکوں کی حیرت

کی انتہا نہ رہی جب جواب میں انہیں اس نوجوان کا ایک نیم مجنونانہ خط ملا جس میں اس نے لکھا تھا کہ آئندہ کبھی وہ ان کی دہلیز پر قدم نہ رکھےگا اور یہ کہ وہ اس قسمت کے ستائے بدنصیب کو بالکل بھول جائیں جس کے لئے اب سوائے موت کے کوئی چارہ نہیں... چند دن بعد سنا گیا کہ وہ واپس فوج میں چلا گیا ہے۔ یہ واقعہ ۱۸۱۲ء کا ہے۔

زمانہ گزرتا رہا۔ کسی کو بیمار ماشا کے سامنے اس واقعہ کا ذکر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ خود ماشا نے کبھی ولادیمیر کا نام تک زبان سے نہ نکالا۔ کئی مہینے بعد اتفاق سے اس نے ان لوگوں کی فہرست دیکھی جنہیں بوردینو کی جنگ میں جانبازی کے انعام میں تمغے عطا ہوئے تھے اور جو خطرناک طور پر زخمی ہو گئے تھے۔ اس فہرست میں ولادیمیر کا نام دیکھکر وہ بیہوش ہو گئی۔ سب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں پھر بخار نہ رہنے لگے مگر شکر ہے کہ اس بیہوشی کا کوئی خطرناک نتیجہ نہیں نکلا۔

چند ہی دنوں بعد اس غریب کو ایک اور صدمہ سہنا پڑا۔ یعنی اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ ساری جائداد کی تنہا وارث تھی مگر اس ورثے سے اسے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس کا دل اپنی غمزدہ ماں کی بیوگی کے دکھ سے اتنا بیقرار تھا کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ کبھی اس سے جدا نہ ہوگی۔ نیناردووا سے بہت سی غمگین یادیں وابستہ تھیں اس لئے دونوں ماں بیٹیاں وہاں سے اپنی جاگیر کے ایک گاؤں «خ» میں رہنے چلی گئیں۔

وہاں بھی اس حسین امیرزادی کے گرد امیدواروں کا ایک جمگھٹ ہو گیا ۔ مگر اس نے کبھی کسی کی ہمت افزائی نہ کی ۔ اس کی ماں اکثر اس کو زندگی کا ساتھی چننے پر اکساتی بھی تو ماریا گاوریلوونا سر ہلا کر خاموش ہو جاتی ۔ ولادیمیر اب اس دنیا میں نہ تھا ۔ جس دن فرانسیسی ماسکو میں داخل ہوئے اس شام اس نے دم توڑ دیا ۔ ماشا نے اس کی یاد کے مقدس سرمائے کو سینے سے لگا رکھا تھا ۔ اس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی یادگار محفوظ تھی ۔ اس کی کتابیں، اس کی بنائی ہوئی تصویریں، اشعار اور موسیقی جو اس نے ماریا کے لئے نقل کئے تھے، سب جوں کے توں محفوظ تھے ۔ جب ہمسایوں کو اس بات کا علم ہوا تو وہ اس کی وفاپرستی پر دنگ رہ گئے ۔ اور سوچنے لگے کہ نہ معلوم وہ کون خوش نصیب ہوگا جو اس پاکباز آرتمس کی سوگوارانہ وفا شعاری پر فتح پائیگا ۔

اسی دوران میں جنگ ختم ہو گئی اور ہماری فتحیاب فوجیں دوسرے ملکوں سے واپس آنے لگیں ۔ لوگ استقبال کے لئے اپنے اپنے گھر چھوڑ کر باہر نکل پڑے ۔ بینڈ پر مفتوح دشمن سے چھینے ہوئے نغموں «ویو هنری کاتر»، ترولیز والز اور «لاجوکوند» کی دھنیں بجائی جانے لگیں ۔ افسر جو بھرتی کے وقت محض کم سن لڑکے تھے، میدان جنگ سے پختہ کار اور باشعور ہوکر بہادری کے تمغے سینوں پر لگائے واپس لوٹے ۔ ہر طرف فوجی خوش خوش آپس میں چہلیں کرتے ۔ تو ان کی گفتگو میں فرانسیسی اور جرمن لفظوں کی آمیزش ہوتی ۔ وہ بھی کیسے ناقابل فراموش دن تھے! فتح و کامرانی کے دن!

ہر روسی کا دل لفظ وطن کی پکار پر کس شدت سے دھڑکتا تھا! برسوں کی جدائی کے بعد ملاقات کے آنسو کس قدر شیریں تھے! سب روسیوں کے دل میں قومی فخر و مباہات اور زار کی محبت کا جذبہ ہم‌معنی ہو چکا تھا اور خود زار کے لئے یہ امر کس قدر بہجت آفریں تھا!

اور اس زمانے میں روسی عورتوں کی دلنوازی بےمثال تھی۔ ان کی فطری سرد مہری غائب ہو چکی تھی۔ وہ خوشی کے نشے میں سرشار تھیں۔ جب وہ فاتح نوجوانوں سے ملتیں تو «اپنی ٹوپیاں ہوا میں اچھال اچھال کر نعرے بلند کرتیں»(۷)۔

اس زمانے کا کوئی فوجی افسر ایسا نہیں جو یہ نہ مانے کہ اس کی جانبازی کا سب سے بیش قیمت صلہ کسی روسی نازنین کا مرہون منت تھا۔

اس خیرہ کن زمانے میں ماریا گاوریلوونا اپنی ماں کے ساتھ «خ» میں رہتی تھی۔ اس نے وہ جوش و خروش نہیں دیکھا جو فوجوں کی آمد کے جشن پر دونوں دارالخلافوں میں تھا۔ لیکن ہر طرف ایک عام جوش پھیلا ہوا تھا جو گاؤں میں شہروں سے بھی بڑھ گیا تھا۔ ان جگہوں میں کسی افسر کا نظر آنا ایک شاندار واقعہ تھا۔ اس کے سامنے اور نوجوانوں کی کوئی بات تک نہ پوچھتا۔

ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ باوجود سرد مہری کے ماریا گاوریلوونا چاہنے والوں کے مجمع میں گھری رہتی تھی۔ مگر اس زمانے میں ایک زخمی فوجی افسر جس کا نام کرنل برمن تھا اس علاقے میں آیا اور چند ہی دنوں میں اور سب

نوجوان پس پشت پڑ گئے ۔ اس کے سینے پر سینٹ جارج کا تمغہ آویزاں تھا ۔ اور مقامی نوجوان لڑکیوں کے خیال میں اس کے چہرے کی رنگت میں ایک دلکش زردی تھی ۔ اس کی عمر کوئی چھبیس سال کی ہوگی ۔ وہ چھٹیوں میں اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کرنے آیا تھا جو ماریا گاوریلوونا کی جاگیر کے بالکل قریب تھی ۔ ماریا گاوریلوونا بھی اس کے ساتھ کچھ خصوصیت برتتی تھی ۔ اس کی موجودگی میں ماریا کے چہرے کی غمگینی شگفتگی میں تبدیل ہو جاتی ۔ اور گو اس کے انداز میں عشوہ و ناز کا شائبہ تک نہ تھا ۔ مگر کوئی شاعر اس کو دیکھتا تو کہہ اٹھتا «اگر یہ محبت نہیں ہے تو کیا ہے؟»

برمن کی شخصیت بڑی دلاویز تھی ۔ اس کی طبیعت اس قسم کی تھی جو عورتوں کے لئے خاص طور پر پرکشش ہوتی ہے: شائستہ اور بالاخلاق، تصنع اور بناوٹ سے پاک، ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی ظرافت کی چاشنی انداز میں ۔ ماریا گاوریلوونا کے سامنے اس کے انداز میں نہایت سادگی ہوتی مگر وہ جو کچھ کہتی، جہاں کہیں جاتی برمن کا خیال اور نظریں اس کا پیچھا کرتے ۔ بظاہر وہ بڑا خاموش طبیعت اور محتاط تھا ۔ لیکن یہ افواہ سنی گئی تھی کہ کسی زمانے میں وہ بڑا منچلا تھا ۔ مگر ماریا گاوریلوونا کی نظروں میں اس وجہ سے اس کی قدر کچھ کم نہ ہوئی کیونکہ اور نوجوان لڑکیوں کی طرح وہ بھی گرمی جذبات اور جرائت کی مداح تھی ۔

مگر جس چیز نے ماریا کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ برمن کا شریفانہ انداز، مزاحیہ اور دلچسپ گفتگو، چہرے کا

دلکش حزن اور زخمی بازو نہ تھا بلکہ وہ ضبط اور جھجک تھی جو برمن کے انداز سے ظاہر تھی۔ ماریا۔ گاوریلوونا کو یقین تھا کہ برمن کے دل پر محبت کا نقش پڑ چکا ہے۔ دوسری طرف برمن بھی اپنی فراست اور تجربے کی مدد سے یہ جانتا تھا کہ ماریا گاوریلوونا اس کی طرف سے بے نیاز نہیں ہے۔ اسی لئے ماریا گاوریلوونا کو حیرت تھی کہ آج تک برمن نے اس کے قدموں پر جھک کر اظہار محبت کیوں نہیں کیا۔ کس خیال نے اسے روک رکھا ہے؟ یہ سچی محبت کی بے زبانی تھی یا خودداری اور تکبر، یا تجربہ‌کار کھل کھیلے ہوئے مرد کی عیاری۔ وہ ماریا گاوریلوونا کے لئے ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ آخر بڑے غوروفکر کے بعد اس نے یہی طے کیا کہ پاس محبت ہی برمن کو اظہار جذبات سے روکے ہوئے ہے۔ چنانچہ اس کی ہمت افزائی کرنے کے لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ اور بھی خصوصیت کا اظہار کرے‌گی بلکہ موقع پڑنے پر تھوڑے بہت التفات سے پیش آئے گی۔ اس نے ایک ایسی تجویز سوچی جو بالکل غیرمتوقع ہوگی اور جو برمن کو اپنے دل کا حال کہنے پر مجبور کر دے گی۔ عورت کے دل کو معموں سے بڑی الجھن ہوتی ہے، خیر ماریا گاوریلوونا کی یہ کوششیں اس قدر کامیاب ہوئیں کہ برمن ہر وقت کسی خیال میں کھویا کھویا رہنے لگا۔ اس کی نگاہ شوق اس والہانہ انداز سے ماریا گاوریلوونا کے چہرے کی بلائیں لیتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ کن لمحہ آ پہنچا ہے۔ پڑوسیوں میں شادی کا تذکرہ اس طرح ہونے لگا گویا یہ کوئی طے شدہ بات ہو، نیک دل

پراسکوویا پتروونا بھی خوش تھیں کہ آخر ان کی بیٹی نے اپنے لئے ایک لائق بر چن لیا۔

ایک دن معمر خاتون ڈرائنگ روم میں تاش پھیلائے پیشنس کھیل رہی تھیں کہ برمن داخل ہوا اور ماریا گاوریلوونا کے متعلق پوچھا۔ «وہ باغ میں ہے» معمر خاتون نے جواب دیا۔ «تم وہیں چلے جاؤ۔ میں یہاں تم دونوں کا انتظار کرتی ہوں۔» برمن باہر چلا گیا۔ بڑی بی نے مارے خوشی کے اپنے پر صلیب کا نشان بنایا، انہیں یقین تھا کہ آج سب معاملہ طے ہو جائے گا۔

برمن نے دیکھا کہ ماریا گاوریلوونا سفید لباس میں ملبوس تالاب کے کنارے بیدمجنوں کے درخت کے سائے میں کتاب پڑھ رہی ہے۔ بالکل جیسے کسی ناول کی ہیروئن ہو۔ معمولی علیک سلیک کے بعد ماریا گاوریلوونا جان بوجھ کر خاموش ہو گئی۔ اس خاموشی نے دونوں کے درمیان جھجھک اور ہلکی سی گھبراہٹ پیدا کر دی، جس کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ برمن اپنی محبت کا اظہار کر دے۔ اور ہوا بھی یہی: برمن کو اس وقت کی خاموشی کے بے تکے پن کا احساس تھا۔ ایک دم اس کی زبان کو گویائی مل گئی۔ اس نے کہا کہ مدت سے وہ ایسے موقعہ کی تلاش میں تھا جب وہ اپنا حال دل ماریا گاوریلوونا کے سامنے بیان کر سکے۔ پھر اس نے التجا کی لمحے بھر کے لئے اس کی بات توجہ سے سنے۔ ماریا گاوریلوونا نے کتاب بند کر دی اور آنکھیں جھکا کے اسے عرض شوق کی اجازت دے دی۔

«مجھے تم سے محبت ہے، انتہائی محبت ہے۔ » (ماریا گاوریلوونا کے گال شرم سے تمتمانے لگے اور سر اور بھی جھک گیا۔) «میں نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی، میں جانتا ہوں کہ تمہیں روز دیکھنے اور تمہاری شیریں گفتگو سننے کی آرزو میری بڑی نادانی تھی۔» (ماریا گاوریلوونا کو سینٹ پیرے کے پہلے خط کا خیال آیا۔) «مگر آہ اب بہت دیر ہو چکی ہے، اب میں اپنی قسمت سے نہیں لڑ سکتا۔ تمہاری یاد، تمہاری حسین اور بے مثل تصویر ہمیشہ میرے دل پر نقش رہیگی، جو میری زندگی کی واحد خوشی بھی ہوگی، اور رنج کا باعث بھی... اب مجھے ایک ناخوشگوار فرض اور انجام دینا ہے، میں ایک راز تمہارے سامنے کھولنے پر مجبور ہوں جو ہمارے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی کر دیگا۔» ماریا گاوریلوونا نے بڑی بے تابی سے اس کی بات کاٹی «یہ رکاوٹ تو ہمیشہ سے موجود تھی، میں تمہاری کبھی نہیں ہو سکتی...» «مجھے معلوم ہے» اس نے بڑی ملائمت سے جواب دیا۔ «مجھے معلوم ہے کہ تم کسی اور سے محبت کرتی تھیں، لیکن موت نے تین سال ہوئے تمہیں اس سے جدا کر دیا۔ مگر پیاری رحمدل ماریا گاوریلوونا! زندگی میں صرف ایک خوش فہمی میرے لئے تسکین کا باعث ہو سکتی ہے، اس سے مجھے محروم نہ کرو، مجھے اس خوش فہمی سے نہ نکالو کہ شاید تم میری خوشی کی خاطر میری بات مان جاتیں اگر... ذرا خاموشی سے میری بات سنو۔ میں التجا کرتا ہوں کہ ذرا خاموش رہو۔ اف، مجھے کس قدر اذیت ہو رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے، مجھے

امید ہوتی ہے کہ تم میری ہو سکتی تھیں۔ لیکن... میں بڑا بدقسمت ہوں کیونکہ میری شادی ہو چکی ہے!»

ماریا گاوریلوونا حیرت سے اسے تکتی رہ گئی۔

«میری شادی ہو چکی ہے» اس نے اپنی بات جاری رکھی «میری شادی کو چار سال ہو چکے ہیں، لیکن مجھے یہ تک معلوم نہیں کہ میری بیوی کون ہے اور کہاں ہے؟ نہ معلوم میری قسمت میں اس سے کبھی ملنا ہے بھی کہ نہیں۔»

«کیا مطلب؟» ماریا گاوریلوونا نے تعجب سے پوچھا۔ «عجیب بات ہے۔ پوری بات بتاؤ، میں بھی پھر قصہ سناؤنگی، مگر تم خدارا بتاؤ پھر کیا ہوا۔»

«۱۸۱۲ء کے شروع کی بات ہے» برمن نے کہا «میں جلدی میں ولنا جا رہا تھا جہاں ہمارا فوجی دستہ ٹھیرا تھا۔ اس دفعہ میں رات کو ایک چوکی پر پہونچا۔ میں نے حکم دیا کہ فوراً گھوڑے جوتے جائیں لیکن اسی وقت طوفانی ہوا چلنا شروع ہوگئی۔ داروغہ اور کوچوان دونوں نے مجھے انتظار کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے ان کی بات تو مان لی، پر ایک عجیب سی بیچینی مجھ پر طاری ہو گئی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے کوئی یوں ہی ڈھکیل رہا ہے۔ اس عرصہ میں طوفان کسی طرح کم نہ ہوا، مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے پھر گھوڑے جوتنے کا حکم دیا اور طوفان ہی میں چل کھڑا ہوا۔ کوچوان کو دریا کے برابر چلنے کی سوجھی کیونکہ اس طرح راستہ تین کوس کم ہو جاتا تھا۔ کنارے مگر گئے تھے اور کوچوان اس جگہ سے آگے نکل گیا جہاں

مڑ کر راستہ پر آنا تھا۔ اس طرح ہم نامعلوم علاقہ میں پہونچ گئے۔ طوفان تھا کہ کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا، میں نے دور سے روشنی دیکھی اور ادھر ہی چلنے کا حکم دیا۔ ہم گاؤں میں پہونچ گئے۔ لکڑی کے گرجا میں روشنی تھی۔ گرجا کھلا ہوا تھا اور منڈیر کے پاس کچھ برف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ برساتی میں لوگ گھوم رہے تھے۔ «ادھر آؤ! ادھر آؤ!» کچھ لوگ چلانے لگے۔ میں نے کوچوان سے ادھر چلنے کو کہا۔ «کمال ہے، تم نے اتنی دیر کہاں لگائی؟» کسی نے مجھ سے کہا۔ «دلہن بیہوش ہے، پادری کی سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے، ہم تو واپس جانے کی سوچ رہے تھے۔ چلو اتر بھی چکو۔» میں خاموشی سے گاڑی سے نیچے کود پڑا اور گرجا میں داخل ہوا جہاں دو تین موم بتیوں کی مدھم روشنی تھی۔ گرجے کے ایک تاریک کونے میں لڑکی ایک بنچ پر بیٹھی تھی، کوئی دوسری اس کی کنپٹیاں سہلا رہی تھی۔ «چلو شکر ہے» یہ دوسری بولی «آپ پہونچ تو گئے۔ بی بی کو تو آپ نے مار ہی ڈالا تھا۔» بوڑھے پادری نے میرے پاس آکر پوچھا «کیا شروع کرنے کا حکم ہے؟» «شروع کیجئے، شروع کیجئے فادر» میں نے کھوئے ہوئے جواب دیا۔ لڑکی کو اٹھایا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ صورت شکل کی بری نہیں... عجیب سی ناقابل معافی شرارت مجھے سوجھی... میں اس کے برابر آلٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پادری جلدی میں تھا، تین مرد اور خادمہ لڑکی کو پکڑے تھے اور صرف اسی کی طرف متوجہ تھے۔ ہمارا نکاح کر دیا گیا۔ «پیار کرو» ہمیں حکم

ملا۔ میری بیوی نے اپنا زرد چہرہ میری طرف پھیرا۔ میں اسے چومنے ہی والا تھا کہ وہ چلا اٹھی «ارے، یہ وہ نہیں ہے، وہ نہیں ہے!» اور بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ گواہوں نے مجھ کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں مڑا اور گرجے سے باہر آیا، کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہ کی۔ جلدی سے میں گاڑی میں بیٹھا اور چلایا — «چلاؤ!»

«او خدایا!» ماریا گاوریلوونا چلا اٹھی۔ «اور تمہیں یہ تک معلوم نہیں کہ تمہاری بدنصیب بیوی پر کیا گذری؟»

«نہیں مجھے تو اس گاؤں کا نام تک معلوم نہیں جہاں میری شادی ہوئی تھی اور نہ یہ یاد ہے کہ میں کس چوکی سے آیا تھا۔ اس وقت اس پورے واقعہ کو میں نے اتنی کم اہمیت دی کہ گرجا سے نکلتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ اور اگلے دن صبح میں تین چوکیوں تک سوتا رہا۔ میرے ساتھ جو نوکر تھا لڑائی میں کام آگیا۔ اب مجھے قطعاً امید نہیں کہ میں اس لڑکی کا پتہ چلا سکوں، جس کے ساتھ میں نے اس قدر بے رحمی سے مذاق کیا تھا۔»

«خدایا» ماریا گاوریلوونا نے اس کی آستین پکڑ کر کہا۔ «وہ تم تھے؟ اور تم نے مجھے پہچانا نہیں؟»

برمن کا رنگ فق ہو گیا اور وہ اس کے قدموں پر گر پڑا۔

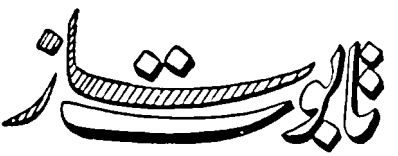

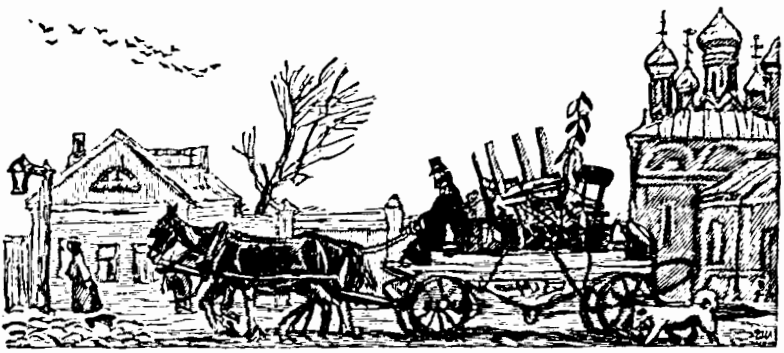

«یہ جو ہر طرف تابوت نظر آتے
ہیں گویا ہمارے عالم پیر کے سفید
بال ہیں» (۸)

درژاوین

تابوت ساز آدریان پروخوروف کے گھر کا سارا ساز و سامان جنازہ لے جانے والی گاڑی پر لد چکا تھا۔ مریل گھوڑے چوتھی دفعہ بسمانیا سڑک سے نکتسکایا سڑک کی طرف چلے جہاں اس نے نیا مکان خریدا تھا۔ اس نے دکان مقفل کرکے باہر دروازہ پر اس اعلان کی تختی لٹکا دی کہ گھر کرایہ یا فروخت کے لئے خالی ہے اور خود پیدل اپنے نئے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس مکان کی اسے مدت سے آرزو تھی اور اس نے بھاری رقم ادا کر کے اسے خریدا تھا۔ مگر جب وہ نئے گھر کی پیلی دیواروں کے قریب پہونچا تو اسے یہ محسوس کر کے بہت تعجب ہوا کہ اس کے دل میں ذرا

خوشی نہ تھی۔ نئے گھر کی اجنبی دھلیز سے گذر کر اس نے دیکھا کہ سارا سامان ابھی تک گڈمڈ پڑا ہے۔ اس وقت اسے اپنا پرانا ٹوٹا پھوٹا مکان یاد آیا جہاں وہ اٹھارہ سال تک رہا تھا، جہاں ہر چیز قرینے سے لگی رہتی تھی۔ اس نے اپنی نوکرانی اور دونوں لڑکیوں کو ان کی سستی پر ڈانٹ بتائی اور خود گھر کی درستگی میں ان کی مدد کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ہر چیز قاعدے سے رکھدی گئی۔ مقدس شبیہیں، چینی کے برتنوں کی الماری، میز، صوفہ اور پلنگ پچھلے کمرے میں ترتیب سے لگا دئے گئے۔ آدریان پروخوروف کے کام کا سامان یعنی مختلف قسم، مختلف رنگوں اور مختلف پیمائش کے تابوت، ماتمی لباس، ماتمی عبائیں اور دستاریں اور مشعلوں سے بھری ہوئی الماریاں باورچی خانے اور دالان میں رکھہ دی گئیں۔ باھر کے دروازے پر سائن‌بورڈ لٹکا دیا گیا جس پر ایک موٹے سے کیوپڈ کی تصویر بنی تھی جس کے ھاتھہ میں ایک الٹی مشعل تھی، نیچے لکھا تھا کہ «سادے اور رنگین تابوت یہاں بنائے جاتے ھیں، نیز کرایہ پر ھر وقت مہیا کئے جا سکتے ھیں، پرانے تابوتوں کی مرمت کا بھی انتظام ھے۔» اس کی بیٹیاں اپنے کمرے میں چلی گئیں، نئے گھر کا معائنہ کرنے کے بعد وہ کھڑکی کے پاس بیٹھہ گیا اور سماوار گرم کرنے کا حکم دیا۔

ھمارے پڑھنے لکھنے قارئین واقف ھیں کہ شیکسپیئر اور سر والٹر اسکاٹ نے اپنی تصانیف میں گورکنوں کو بڑا خوش‌طبع اور زندہ‌دل دکھایا ھے تاکہ اس طرح کے تضاد سے وہ ھمارے ذھن پر گہرا اثر چھوڑ سکیں۔ مگر ھمیں سچائی زیادہ عزیز

ہے اس لئے ہم ان کی تقلید نہیں کر سکتے۔ اور یہ کہنا پڑیگا کہ ہمارے تابوتساز کی طبیعت اس کے منحوس پیشے کے لئے بالکل مناسب تھی۔ آدریان پروخوروف بہت خاموش اور افسردہ مزاج آدمی تھا۔ اس کی چپ صرف دو موقعوں پر ٹوٹتی تھی: ایک جب اسے اپنی بیٹیاں کھڑکی میں سے تاک جھانک کرتی نظر آتیں تو انہیں ڈانٹنے پھٹکارنے کو اس کی زبان کھل جاتی اور یا جب اسے کسی بدنصیب (یا خوش نصیب) گاہک سے اپنی محنت کی زیادہ سے زیادہ اجرت وصول کرنی ہوتی۔ اس وقت بھی حسب معمول آدریان گم سم کھڑکی کے پاس بیٹھا چائے کی ساتویں پیالی پی رہا تھا اور اپنے افسردہ خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اسے وہ موسلادھار بارش یاد آئی جو پچھلے ہفتہ ریٹائرڈ شدہ بریگیڈیر کا جنازہ عین قبرستان میں پہونچتے ہی ہوئی تھی۔ پانی پڑنے سے نہ جانے کتنی عبائیں سکڑ گئی ہونگیں، ٹوپیوں کے پٹے تڑمڑ گئے ہونگے۔ اس کے ہاں کا سامان بہت پرانا اور خستہ حالت میں تھا۔ اس لئے اسے ڈر تھا کہ چیزوں کو ٹھیک کرانے میں کافی روپیہ خرچ ہو جائیگا۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ نقصان سوداگر کی بوڑھی بیوہ تریوخینا کی تجہیز و تکفین سے پورا ہو جائیگا جو پچھلے سال سے گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ وہ محلہ رازگلیائی میں رہتی تھی جو وہاں سے کافی دور تھا۔ پروخوروف کو ڈر تھا کہ اس کے وارث وعدہ کرنے کے باوجود وقت پر اسے بھول جائینگے اور کسی پاس کے تابوت ساز سے معاملہ کرلینگے۔

وہ اسی سوچ میں پڑا تھا کہ باہر کے دروازے پر کسی نے تین بار کمزور دستک دی۔ «کون ہے؟» آدریان نے چلا کر پوچھا۔ دروازہ کھلا اور ایک آدمی جو کوئی جرمن کاریگر معلوم ہوتا تھا کمرے میں داخل ہوا اور بشاش لہجے میں آدریان سے کہنے لگا «معاف کرنا ہمسائے» اس نے ٹوٹی پھوٹی روسی میں کہا جسے سن کر کوئی ہنسے بنا نہیں رہ سکتا۔ «اگر میری وجہ سے تمہارے کام میں ہرج ہوا ہو تو معاف کرنا، مگر میں کئی دن سے تم سے ملنا چاہ رہا تھا۔ میں موچی کا کام کرتا ہوں، میرا نام گوٹلب شلٹز ہے۔ تمہاری کھڑکی میں سے جو چھوٹا سا گھر نظر آتا ہے نا میں اسی میں رہتا ہوں۔ کل میری شادی کی پچیسویں سالگرہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم اور تمہاری لڑکیاں آ کر ہمارے ہاں کھانا کھائیں۔» یہ دعوت بڑی خوش دلی سے قبول کر لی گئی۔ آدریان نے موچی کو بیٹھنے اور چائے پینے کو کہا اور کچھ ہی دیر میں گوٹلب شلٹز کی سادہ اور پر خلوص طبیعت کی وجہ سے دونوں گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔ آدریان نے پوچھا «سناؤ تمہارے کار و بار کا کیا حال ہے؟» «شکر ہے چل رہا ہے» شلٹز نے جواب دیا «اونچ نیچ تو ہمارے ہاں بھی ہوتی ہی رہتی ہے مگر اس کی شکایت کیا؟ میرا کام تمہاری طرح کا نہیں ہے کیونکر زندہ آدمی بغیر جوتوں کے گذارہ کر سکتا ہے مگر مردہ بغیر تابوت کے نہیں رہ سکتا۔» «بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک» آدریان نے اتفاق کرتے ہوئے کہا «مگر ساتھ ساتھ یہ بھی تو ہے کہ زندہ آدمی کے پاس جوتے خریدنے کو دام نہ ہوں تو

وہ ننگے پاؤں پھر لیگا تمہارا نقصان نہیں کریگا۔ مگر مردہ بھک منگوں کو مفت تابوت دینا پڑتا ہے۔» کچھہ دیر تک یوں ہی بات چیت چلتی رہی۔ آخر موچی اٹھا اور جانے کی اجازت چاہی، چلتے چلتے ایک دفعہ اپنے ہاں آنے پر پھر اصرار کیا۔

اگلے دن عین دو پہر کے وقت آدریان اور اس کی بیٹیاں اپنے نئے گھر سے نکل کر پڑوسی کے گھر جانے کے لئے روانہ ہوئیں۔ میں آج کل کے ناول‌نگاروں کی طرح آدریان پروخوروف کی روسی کفتان اور اس کی بیٹیوں اکولینا اور داریا کے یورپین لباسوں کا بہ‌تفصیل تذکرہ نہیں کرونگا۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ دونوں خواتین پیلے رنگ کی ٹوپیاں اور سرخ سلیپر پہنے ہوئے تھیں جو وہ خاص خاص موقعوں پر پہنتی تھیں۔

موچی کا ننھا سا کمرہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ ان میں زیادہ‌تر جرمن اہل حرفہ، ان کی بیویاں اور ان کے شاگرد شامل تھے۔ صرف ایک روسی افسر تھا، وہ تھا پولیس کانسٹبل یورکو۔ گو اس کا عہدہ بہت معمولی تھا مگر میزبان کی اس پر نظر عنایت تھی۔ پچیس سال تک وہ پوگوریاسکی کے مشہور ڈاکیہ (۹) کی طرح اپنے فرائض کی انجام دھی کرتا رہا تھا۔ مگر ۱۸۱۲ء میں جب آگ نے ماسکو کے قدیم دارالخلافے کو جلا کر تہس نہس کردیا تو پولیس کانسٹبل کا زرد چوبی کمرہ بھی جل کر راکھہ ہو گیا۔ مگر دشمن کے بھاگتے ہی اس کی جگہہ ایک نیا سنتری‌خانہ تعمیر ہوا جس پر خاکستری روغن ہوا تھا اور بھدے سفید ستون تھے۔ یورکو نے حسب سابق سر سے پاؤں تک مسلح ہو کر ٹہلنا شروع کر دیا۔

نکتسکی دروازے کے آس پاس کی گلیوں میں بسنے والے تقریباً سب جرمنوں سے وہ واقف تھا جن میں سے بعض کو کبھی کبھی اتوار کی رات اس کے پہرے خانے میں بسر کرنی پڑتی تھی۔ آدریان اس سے تعارف کرنے بڑھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جلد یا بدیر اسے کانسٹبل صاحب کی مدد کی ضرورت ہوگی۔ جب مہمان میز پر بیٹھے تو دونوں ایک دوسرے کے پاس پاس تھے۔ شلٹز، اس کی بیوی اور ان کی سترہ سالہ لڑکی لوٹ خین مہمانوں کے ساتھ شریک طعام بھی تھے اور کھانا پیش کرنے میں نوکروں کی مدد بھی کر رہے تھے۔ بیر پانی کی طرح پی جا رہی تھی۔ یورکو نے چار آدمیوں کے برابر کھایا۔ آدریان بھی کچھ پیچھے نہ تھا، مگر اس کی بیٹیاں بڑے تکلف سے کھا رہی تھیں۔ گفتگو زیادہتر جرمن زبان میں ہو رہی تھی۔ آوازیں بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھیں کہ اتنے میں میزبان نے سب کو اپنے طرف متوجہ کر کے ایک بوتل کھولی اور پھر بہآواز بلند روسی میں کہا «میری نیک شریک زندگی لوئیزا کا جام صحت!» ہلکے رنگ کی شامپین بوتل میں سے ابلنے لگی۔ میزبان نے اپنی ادھیڑ عمر شریک زندگی کے شگفتہ چہرے کو پیار کیا اور مہمان خوشی خوشی نیک لوئیزا کا جام صحت پینے لگے۔ میزبان نے دوسری بوتل کا کاگ اڑاتے ہوئے کہا «اور یہ ہے میرے عزیز مہمانوں کا جام صحت!» مہمانوں نے شکریہ ادا کر کے گلاس پھر خالی کر دئے۔ اب کیا تھا پے درپے جام صحت پئے جانے لگے۔ پہلے ہر مہمان کا جام صحت پیا گیا۔ پھر ماسکو شہر کا، پھر جرمنی کے چھوٹے چھوٹے درجن بھر

غیرمعروف شہروں کا، پھر ہر قسم کے کار و بار کا، پھر ہر کاریگر اور اس کے شاگرد کا۔ آدریان نے نہایت ایمانداری سے ہر دفعہ گلاس خالی کیا۔ آخر میں وہ نشہ میں اتنا دھت ہو چکا تھا کہ ترنگ میں آکر اس نے بھی ایک جام صحت تجویز کیا جو سب نے خوشی خوشی پیا۔ اتنے میں ایک مہمان نان بائی نے اپنا گلاس اٹھا کر پرجوش لہجے میں کہا «ان کا جام صحت جن کے لئے ہم کام کرتے ہیں یعنی ہمارے گاہکوں کے لئے!» یہ جام بھی اوروں کی طرح متفق طور پر جوش و خروش کے ساتھ پیا گیا۔ اب مہمانوں نے ایک دوسرے سے معانقہ شروع کیا۔ درزی نے موچی سے، موچی نے درزی سے، نان بائی نے ان دونوں سے، پھر سب لوگوں نے نان بائی سے، اور یہ سلسلہ اس طرح چلتا رہا... ان باہمی معانقوں کے دوران میں یورکو نے تابوت ساز سے کہا «پڑوسی! تم اپنے مردوں کا جام صحت پئیو نا؟» اس پر سب ہنس پڑے سوائے تابوت ساز کے جس نے غصے سے بھوئیں سکیڑ لیں۔ مگر سب پینے پلانے میں اتنے مشغول تھے کہ کسی نے اس کی اس حرکت پر توجہ نہ دی۔ جب سب رخصت ہونے کے لئے اٹھے تو گرجا سے شام کے گھنٹوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

مہمانوں کے رخصت ہوتے ہوتے کافی دیر ہو گئی سب نشے میں دھت تھے۔ موٹے نان بائی اور ایک جلد ساز نے جس کا چہرہ سرخ مراکو چمڑے میں مجلد معلوم ہوتا تھا کانسٹبل کو بغلوں میں ہاتھ دے کر اس کے ٹھکانے تک پہونچا دیا۔ اور اس طرح روسی کہاوت کہ «قرض کی ادائیگی نعمت ہے»

پورا کر دکھایا۔ تابوت ساز گھر پہونچا تو ناراض اور جھنجلایا ہوا تھا۔ «آخر یہ کیا بات ہے» اس نے بہ آواز بلند سوچتے ہوئے کہا «کہ اور سب پیشے تو قابل عزت ہیں، میرا پیشہ کس بات میں گھٹیا ہے؟ کیا تابوت ساز جلاد کا بھائی بند ہوتا ہے؟ آخر یہ غیرملکی احمق جرمن کس بات پر ہنس رہے تھے؟ کیا ان کے خیال میں تابوت ساز احمق یا مسخرہ ہے؟ اور میں... میں سوچ رہا تھا کہ اپنے نئے گھر کی خوشی میں جو دعوت کرونگا تو ان سب کو بلاؤنگا، مگر اب؟ اب نہیں... بس اب تو میں ان لوگوں کو بلاؤنگا جن کی میں خدمت کرتا ہوں۔ یعنی عیسائی لاشوں کو۔» «جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟» اس کی نوکرانی نے اس کے جوتے اتارتے ہوئے کانپ کر کہا۔ «ذرا آپ سوچئے تو... خدا کے لئے اپنے پر صلیب کا نشان بنائیے۔ مردوں کو اپنے گھر دعوت پر بلائیےگا؟ اف خدایا میری توبہ!» «ہاں تو کیا ہوا، خدا گواہ میں ایسا ہی کرونگا» آدریان نے کہا «اور کل ہی بلاؤنگا! اے میرے محسنوں کی روحو کل رات کا کھانا میرے ساتھہ کھاؤ اور جو کچھہ روکھا سوکھا میرے پاس ہے اس میں شریک ہوکر میری عزت بڑھاؤ۔» یہ کہہ کر تابوت ساز اپنے پلنگ پر لیٹ گیا اور خراٹے لینے لگا۔

صبح کا اندھیرا پوری طرح غائب نہ ہوا تھا کہ آدریان کو اٹھنا پڑا۔ تاجر کی مالدار بیوہ تریوخینا کا انتقال رات کو ہو گیا تھا۔ اس کے مختار خاص کے پاس سے ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر یہ خبر آدریان کو پہونچانے آیا۔ تابوت ساز نے اسے دس کوپک ووڈکا پینے کے لئے انعام دئے

اور خود عجلت کے ساتھہ کپڑے تبدیل کرکے ایک گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر رازگلیائی میں پہونچا۔ میت کے دروازے پر پولیس کا پہرہ تھا۔ تاجر گدھوں کی طرح منڈلاتے ہوئے ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ میت میز پر رکھی تھی۔ بےجان مومی چہرے کے نقش و نگار ابھی تک بگڑے نہ تھے۔ رشتہدار، پڑوسی اور نوکر چاکر چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ ساری کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اندر مومی شمعیں جل رہی تھیں اور پادری دعائے میت پڑھہ رہے تھے۔

آدریان متوفیہ کے بھتیجے کے پاس گیا جو نہایت فیشن‌ایبل کوٹ میں ملبوس ایک نوجوان تاجر تھا۔ آدریان نے جاکر کہا کہ تابوت، شمعیں، تابوت بردار اور جنازے کے ساتھہ کی اور ضروری چیزیں جلد از جلد اچھی حالت میں مہیا کر دی جائینگی۔ وارث نے بے خیالی کے ساتھہ شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ مول تول کرنا نہیں چاہتا ہر بات اس کے ایمان پر چھوڑتا ہے۔ تابوت ساز نے حسب عادت قسم کھا کر کہا کہ وہ ایک کوپک زیادہ لینا بھی حرام سمجھتا ہے۔ اس کے بعد اس نے مختار خاص سے نظروں ہی نظروں میں کچھہ طے کیا اور اپنے گھر آکر تیاری میں مشغول ہو گیا۔ سارے دن وہ نکتسکی دروازے سے رازگلیائی تک پھیرے کرتا رہا اور شام تک ہر چیز قاعدے کے مطابق وہاں پہونچ گئی۔ اور وہ کوچوان کو چھٹی دے کر اپنے گھر پیدل روانہ ہوا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ تابوت ساز بخیریت نکتسکی دروازے تک پہونچ گیا۔ جب وہ شہیدوں کے گرجا کے پاس سے گذرا تو ہمارے دوست

یورکو نے ڈپٹ کر پوچھا «کون ہے؟» مگر پھر تابوت‌ساز کو پہچان کر اس نے اسے شب بخیر کہا۔ رات زیادہ گزر چکی تھی۔ آدریان گھر کے قریب پہونچا تو اسے ایسا لگا کہ کوئی چپکے سے اس کے دروازے میں غائب ہو گیا۔ «اس کا کیا مطلب؟» آدریان سخت حیران تھا۔ «اس وقت کس کو میری ضرورت ہو سکتی ہے؟ کیا خبر کوئی چور ڈاکو ہو؟ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی میری احمق لڑکیوں کے پاس رات گزارنے آیا ہو؟» اسے فوراً اپنے دوست یورکو کو مدد کے لئے بلانے کا خیال آیا۔ اتنے میں ایک آدمی دروازے کے پاس پہونچا اور اندر داخل ہونے ہی والا تھا کہ اس کی نظر آدریان پر پڑی جو تیزی سے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ٹھہر گیا، اس نے اپنی وردی کی ٹوپی سلام کے طور پر اٹھائی۔ آدریان کو اس کا چہرہ کچھہ دیکھا دیکھا معلوم ہوا۔ «آپ کو کیا مجھہ سے ملنا ہے؟» اس نے تقریباً ہانپتے ہوئے سوال کیا۔ «اندر تشریف لے آئیے۔» «تکلف کی ضرورت نہیں صاحب» اجنبی نے کھوکھلی آواز میں جواب دیا «آپ پہلے تشریف لے چلئے اور اپنے مہمانوں کو راستہ دکھائیے۔» آدریان کو گھر پہونچنے کی اتنی جلدی تھی کہ اسے خود ہی تکلف گوارا نہ تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ گھر کی سیڑھیوں تک پہونچ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے دوسرا بھی۔ آدریان کو لگا کہ اس کے گھر میں کچھہ لوگ ادھر ادھر چل پھر رہے ہیں۔ «لعنت خدا کی، آخر یہ بات کیا ہے؟» اس نے تیزی سے اندر داخل ہوتے ہی سوچا اور... اس کے گھٹنے جواب دے گئے جب

اس نے دیکھا کہ سارا کمرہ لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے چاندنی ان کے سرد اور نیلگوں چہروں، دھنسے ہوئے دھانوں، دھندلی نیم وا آنکھوں، اور ستی ہوئی ناکوں پر پڑ رہی تھی۔ آدریان نے خوف زدہ نگاہوں سے ان لوگوں کو پہچانا جن کے کفن دفن میں اس نے مدد کی تھی۔ اس کے پیچھے آنے والا وہی فوجی افسر تھا جو پچھلے ہفتے موسلادھار بارش میں دفن ہوا تھا۔ سب مرد اور عورتیں اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور اسے سلام اور مبارکباد پیش کرنے لگے۔ سوائے ایک غریب کے جو چند ہی دن ہوئے مفت دفنایا گیا تھا۔ اسے قریب آنے کی جرأت نہ ہوئی، وہ کمرے کے کونے میں ایسی عاجزی سے کھڑا تھا جیسے اسے اپنے چیتھڑوں پر شرم آ رہی ہو۔ سوائے اس کے سبھی ڈھنگ کے لباس پہنے ہوئے تھے۔ خواتین ربن والی ٹوپیاں اوڑھے تھیں، فوجی افسر اپنی کرم خوردہ یونیفارم میں تھے۔ سب کی حجامتیں بڑھی ہوئی تھیں۔ تاجر نہایت بڑھیا لباس میں تھے۔ فوجی افسر نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا «پروخوروف! ہم سب لوگ تمہارے بلاوے پر اٹھ کر آئے ہیں۔ صرف وہ جو بالکل خاک در خاک ہو چکے تھے یا وہ جو محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے اور اٹھنے سے معذور ہیں نہیں آ سکے، مگر ان میں سے بھی ایک آنے کا اتنا خواہش‌مند تھا کہ نہ رک سکا...» اس پر ایک چھوٹا سا ڈھانچہ مجمع میں گھس کر راہ بناتا ہوا آدریان کی طرف آیا۔ اس کے بے رونق چہرے پر محبت بھری خوفناک مسکراہٹ تھی۔ شوخ سبز اور سرخ رنگ کے کپڑے

کی دھجیاں اس کے چاروں طرف اس طرح لٹک رہی تھیں جیسے وہ کوئی کھمبا ہو۔ ٹانگوں کی ہڈیاں اس طرح کھڑکھڑا رہی تھیں جیسے ہاون میں موسلی۔ «ارے پروخوروف! کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟» ڈھانچے نے کہا۔ «کیا تم ریٹائرڈ شدہ سارجنٹ پیوتر پتروویچ کریل‌کن کو بھول گئے جس کے لئے تم نے پہلا تابوت بیچا تھا (جو تھا تو صنوبر کی لکڑی کا مگر تم نے بلوط کا کہکر بیچا) ۱۷۹۹ء میں۔» ان الفاظ کے ساتھ ڈھانچے نے اپنے بازو بغل گیر ہونے کے لئے بڑھائے۔ آدریان نے پوری طاقت سے چیخ ماری اور اسے دھکا دے کر اپنے سے پرے کر دیا۔ پیوتر پتروویچ جھوما اور زمین پر ہڈیوں کا ڈھیر بنکر آ رہا۔ لاشوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سب اپنے ساتھی کی ہتک کا بدلہ لینے کے لئے، کوسنے اور دھمکیاں دیتے ہوئے آدریان کی طرف بڑھے۔ بدقسمت میزبان ان کی چیخوں سے تقریباً بہرا اور ان کے حملے سے اتنا بدحواس ہوا کہ بےہوش ہوکر مرحوم سارجنٹ کی ہڈیوں کے ڈھیر پر گر پڑا۔

سورج کی شعاعیں تابوت‌ساز کے پلنگ پر پڑ رہی تھیں۔ گرمی سے اس نے آنکھیں کھولیں تو خادمہ کو سماوار میں انگارے سلگانے میں مصروف پایا۔ آدریان کو گذشتہ رات کے خوفناک واقعات یاد آئے۔ تریوخینا، فوجی افسر اور سارجنٹ کریل‌کن، ابھی تک اس کے تخیل میں دھندلے دھندلے سایوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ پہلے تو وہ چپ چاپ انتظار کرتا رہا کہ شائد ملازمہ خود ہی بات چھیڑے اور رات کے واقعہ کا انجام بتائے۔

«آدریان پروخوروچ جناب، آج آپ بہت دیر تک سوتے رہے» اکسینیا نے اسے لباس دیتے ہوئے کہا۔ «ہمارا پڑوسی درزی آپ سے ملنے آیا تھا اور پولیس کانسٹبل یہ بتانے کہ آج پولیس انسپکٹر صاحب کی سالگرہ ہے۔ مگر آپ تو ایسے بےخبر سو رہے تھے کہ ہمارا جی نہ چاہا کہ آپ کی نیند خراب کریں۔»

«مرحومہ تریوخینا کے ہاں سے تو کوئی نہیں آیا؟»

«مرحومہ؟ یعنی کیا... کیا وہ مر گئیں؟»

«تم بھی کتنی احمق ہو۔ کیا کل تم نے ان کے کفن دفن کا سامان تیار کرنے میں میرا ہاتھہ نہیں بٹایا تھا؟»

«آپ کا دماغ درست ہے جناب؟ یا ابھی تک رات کی شراب کا خمار باقی ہے؟ کل کس کا کفن دفن ہوا تھا؟ سارے دن تو آپ جرمن کے ہاں دعوت میں رہے۔ رات کو بالکل مدہوش واپس آئے۔ اور آتے ہی ایسے بے سدھہ پلنگ پر پڑ گئے کہ اب جاگے ہیں۔ گرجا کے گھنٹے بھی بج بج کر بند ہو گئے۔»

«اچھا؟ سچ مچ؟» تابوت‌ساز نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

«سچ مچ نہیں تو کیا؟» ملازمہ نے جواب دیا۔

«اگر ایسا ہے تو لاؤ چائے جلدی سے، اور میری بیٹیوں کو بھی بلا لاؤ۔»

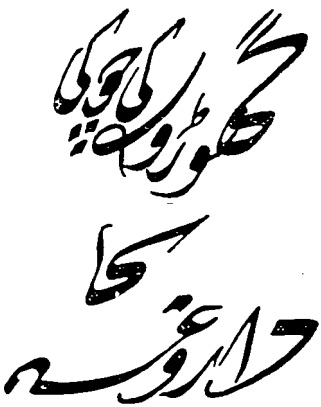

«وہ ایک معمولی درجہ کا کلرک تھا
پر اپنی گھوڑوں کی چوکی کا مطلق
العنان فرماں روا۔» (۱۰)
شہزادہ ویازیمسکی

مجھے کوئی ایسا آدمی دکھائیے، جسے کبھی نہ کبھی کسی گھوڑوں کی چوکی کے داروغہ کو گالیاں کوسنے دینے یا تو تو میں میں کرنے کا موقعہ نہ پیش آیا ہو یا ایسا آدمی دکھائیے جس نے غصے سے بے قابو ہوکر رجسٹر طلب نہ کیا ہوتا کہ وہ اس کے خلاف بدتمیزی، گستاخی اور بدانتظامی کی شکایت لکھ سکے۔ کون ہے جو داروغہ کو انسانی شکل میں شیطان، معزول سرکاری افسروں کی طرح نا قابل اصلاح اور کچھ نہیں تو مورم جنگل میں رہنے والے ڈاکوؤں سے کم سمجھتا

ہو۔ مگر ہم انصاف کرنے کی کوشش کرینگے، ہم اپنے کو اس کی جگہ رکھہ کر دیکھینگے اور اس طرح ممکن ہے کہ ہم اس کو زیادہ نرمی کے ساتھہ جانچ سکیں۔ ایک گھوڑوں کی چوکی کا داروغہ ہوتا ہی کیا ہے؟ وہ چھوٹے موٹے افسروں کے سامنے ایک نہایت ہی مظلوم اور حقیر ہستی ہے جو مکے اور لاتیں کھانے سے صرف اس لئے بچ جاتا ہے کہ وہ سرکاری عہدہدار ہے، مگر ایسا بھی ہمیشہ نہیں ہوتا (پڑھنےوالے خود ہی ایمان سے کہہ دیں)۔ اس بیچارے جابر فرمانروا کی حیثیت کیا ہے؟ (شہزادے ویازیمسکی نے ایک جگہہ مذاق میں گھوڑوں کی چوکی کے داروغہ کو مطلق العنان فرمانروا کے لقب سے یاد کیا ہے۔) کیا اس کا کام انتہائی مشکل نہیں ہے؟ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام۔ مسافر راستے بھر کی کوفت اور تھکن کا سارا غصہ بےچارے داروغہ پر اتارتے ہیں۔ موسم انتہائی خراب ہے، سڑکیں ناقابل برداشت ہیں، کوچوان سرکش ہے، گھوڑے سست رفتار ہیں۔ مگر ان سب کا ذمہدار ہے تو بےچارہ داروغہ۔ مسافر جب اس کے غریبانہ مکان میں داخل ہوتا ہے تو شروع ہی سے اسے اپنا دشمن سمجھہ کر بات کرتا ہے، اور وہ بڑی خوش نصیب گھڑی ہوگی جب داروغہ اس بن بلائے مہمان سے چھٹکارا پاسکےگا اور اگر اسی وقت گھوڑے نہ ہوئے تو؟ بس پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ کیا کیا گالیاں اور دھمکیاں سننی پڑینگی۔ بارش اور کیچڑ میں گھر گھر مارا مارا پھرنا ہوگا۔ بارش کے دوران میں، جنوری کی ٹھٹھرنے والی سردی میں سرائے کے باہر برساتی میں جاکھڑا ہوگا تاکہ اسی طرح جھلائے ہوئے

مسافر کے دھکے اور ڈانٹ کھانے سے بچ سکے۔ یا مثلاً کبھی کوئی جرنیل صاحب تشریف لائے اور غریب داروغہ نے مارے ڈر کے کانپتے ہوئے دونوں تین گھوڑوں کی گاڑیاں انہیں دیدیں، جن میں سے ایک گاڑی ڈاک کے لئے تھی۔ جرنیل صاحب تو شکریہ ادا کئے بغیر روانہ ہو گئے، پانچ منٹ بعد گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ اور ایک افسر نے اندر داخل ہوکر سرکاری حکم‌نامہ میز پر پٹخ دیا جس میں ڈاک کے لئے تازہ‌دم گھوڑوں کے مہیا کرنے کا مطالبہ ہے۔ ان سب حالات پر غور کیجئے اور آپ کا دل بجائے غصے کے پرخلوص ہمدردی سے بھر آئیگا۔ اس موضوع پر چند جملے اور سن لیجئے۔ میں تقریباً بیس سال تک روس کے کونے کونے میں پھرا ہوں۔ ڈاک گاڑی کے تقریباً سب راستوں سے واقف ہوں، کوچوانوں کی کئی نسلوں کو جانتا ہوں۔ شائد ہی ایسا کوئی داروغہ ہو جسے میں نہ جانتا ہوں اور جس سے میرا واسطہ نہ پڑا ہو۔ میرا ارادہ اپنے سفر کے دلچسپ مشاہدات کے متعلق کتاب چھپوانے کا ہے۔ مگر فی الحال اتنا کہنا کافی ہوگا کہ داروغوں کے قبیلے کے متعلق بہت ہی غلط سلط باتیں عام لوگوں کو بتائی گئی ہیں اور یہ بےچارے مفت میں بدنام ہیں۔ وہ عام طور پر نہایت صلح پسند، ملنسار اور ضرورت سے زیادہ خاکسار ہوتے ہیں۔ ان میں نہ لالچ ہوتا ہے، نہ اپنا حق زبردستی منوانے کی عادت ہوتی ہے۔ ان کی گفتگو سے بہت سی مفید اور دلچسپ اطلاعات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں جسے عام طور پر مسافر قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور یہ ان کی بڑی غلطی ہے۔ مجھے تو ان کی

گفتگو اپنے ہاں کے دوسرے درجے کے سرکاری افسروں کی بات چیت سے کہیں بہتر معلوم ہوتی ہے۔

آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس معزز پیشے میں میرے بہت سے دوست ہیں۔ ان میں سے ایک کی یاد مجھے بہت ہی عزیز ہے۔ میں اپنے پڑھنے والوں کو اس وقت اسی کی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔

مئی ۱۸۱٦ء میں مجھے صوبہ «خ» میں ایسے راستے سے سفر کرنے کا اتفاق ہوا جو اب مدت سے غیر مستعمل ہے۔ اس زمانے میں میری حیثیت ایک ادنی سرکاری افسر کی تھی۔ مجھے ڈاک گاڑی سے سفر کرنا پڑتا تھا۔ اور میری حیثیت صرف دوگھوڑوں کی گاڑی میں سفر کرنے کی تھی۔ اسی وجہ سے اکثر داروغہ مجھ سے توہین آمیز برتاؤ کرتے اور مجھے بزور اپنا حق منوانا پڑتا، کیونکہ اس زمانے میں میں نوجوان اور شوریدہ سر تھا۔ اگر کبھی کوئی داروغہ کسی بڑے افسر کو وہ گھوڑے دے دیتا جن پر میرا حق تھا تو مجھے اس کمینےپن اور چاپلوسی پر بہت ہی غصہ آتا۔ اسی طرح گورنر کی میز پر اگر کوئی گستاخ نوکر کھانا پیش کرتے ہوئے مجھے نظر انداز کرتا تو مجھے بہت ہی ناگوار گزرتا۔ اس قسم کے برتاؤ کا عادی ہونے میں مجھے کافی عرصہ لگا۔ آج مجھے یہ دونوں دستور بالکل مناسب بلکہ ایک حد تک ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ بھلا آپ ہی بتائیے کہ اگر یہ قانون ہٹا دیا جائے کہ چھوٹے رتبے والے اعلی رتبے والوں کو جگہہ دیں اور اس کی بجائے یہ ہونے لگے کہ ادنی دماغ والے اعلی دماغ والوں

کو جگہہ دیں تو کس قدر گڑبڑ ہو۔ کیا کیا جھگڑے اٹھیں۔ نوکر پہلے کس کا کام کریں؟ ... مگر خیر مجھے ان باتوں سے کیا غرض، میں تو آپ کو ایک کہانی سنا رہا تھا۔

بڑا ہی گرم دن تھا۔ «خ» کے ڈاک اسٹیشن سے تقریباً تین کوس ادھر ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی جو تھوڑی دیر میں موسلا دھار میں تبدیل ہو گئی اور میں بالکل شرابور ہو گیا۔ اسٹیشن پر پہونچتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ جلدی جلدی کپڑے بدلے، اور پھر دل چاہا کہ کاش ایک پیالہ گرم چائے میسر آ سکتی۔ داروغے نے آواز دی «اے دونیا! سماوار گرم کر جلدی سے اور جاکر کچھہ بالائی بھی لے آ۔» اس کے جواب میں درمیان کی دیوار کے پیچھے سے ایک چودہ سالہ لڑکی نکلی اور برساتی کی طرف چلی گئی۔ میں اس کے حسن و جمال کو دیکھکر ہکا بکا رہ گیا۔ «کیا تمہاری لڑکی ہے؟» «ہاں» داروغہ نے بڑی دلجمعی سے جواب دیا «بڑی ہی تیز، سمجھدار، اور پھرتیلی ہے، بالکل اپنی مرحومہ ماں کی طرح۔» اس نے سرکاری حکمنامے کی نقل کرنی شروع کر دی۔ میں وقت گزارنے کے لئے دیواروں پر لگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا۔ اس کا گھر غریبانہ مگر صاف ستھرا تھا۔ تصویریں «مسرف بیٹے» کی کہانی کے متعلق تھیں۔ پہلی تصویر میں ایک معزز بزرگ لمبی عبا پہنے اور شب خوابی کی ٹوپی اوڑھے ایک بےچین صورت نوجوان کو روپوں کی تھیلی اور دعائیں دیتے ہوئے رخصت کر رہا تھا۔ دوسری تصویر میں نوجوان جھوٹے دوستوں اور بےحیا عورتوں کے مجمع میں بیٹھا اپنی پونجی شراب اور جوے

میں لٹا رہا تھا۔ تیسری تصویر میں نوجوان بیٹا چیتھڑے کپڑے پہنے اور پرانا ہیٹ اوڑھے سوروں کے گلے کو ہانک رہا تھا۔ اس کے چہرے سے انتہائی افسوس اور شرمندگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ آخری تصویر میں اس کی واپسی دکھائی گئی تھی۔ نیک بزرگ ابھی تک عبا اور شب خوابی کی ٹوپی اوڑھے ہوئے ہے۔ وہ بیٹے کو دیکھ کر دوڑتا ہوا بڑھتا ہے۔ بیٹا اس کے قدموں میں جھک جاتا ہے۔ پس منظر میں نوکر ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کر رہا ہے۔ اور بڑا بھائی اس سے جشن کی وجہہ پوچھہ رہا ہے۔ تصویروں کے نیچے مناسب شعر جرمن زبان میں لکھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں پڑھا۔ ان تصویروں، گل مہندی کے پودوں، مسہری اور اس کے شوخ رنگ کے گل بوٹوں والے پردوں اور ادھر ادھر رکھی ہوئی چیزوں کی یاد آج بھی میرے دماغ ویسی ہی تازہ ہے۔ میں اب بھی اپنی آنکھوں کے سامنے اس گھوڑوں کی چوکی کے داروغہ کو دیکھہ رہا ہوں۔ پچاس سال کے لگ بھگ عمر کا تندرست اور زندہ دل انسان تھا۔ اس کے لمبے سبز کاھی کوٹ پر رنگ اڑے ہوئے ربن میں تین تمغے آویزاں تھے۔

میں نے کوچوان کو کرایہ دے کر رخصت ہی کیا تھا کہ دونیا سماوار لئے واپس آ گئی۔ اس شوخ نازنین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھہ پر اس کے حسن کا کیا اثر ہوا ہے۔ اس نے اپنی حسین نیلگوں آنکھیں بناوٹی شرم سے جھکا لیں۔ مگر جب میں نے اس سے بات کی تو اس نے بغیر گھبرائے جواب دیا جیسے وہ دنیا کے طور طریقوں سے واقف ہو۔ میں نے اس کے

باپ کو شراب کا گلاس پیش کیا اور اسے چائے کی پیالی۔ تھوڑی دیر میں ہم تینوں اس طرح باتیں کرنے لگے گویا برسوں کی جان پہچان ہو۔

اتنے میں گھوڑے تیار ہو گئے۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ داروغہ اور اس کی بیٹی کو چھوڑ کر جاؤں مگر مجبور تھا۔ آخر بادل ناخواستہ ان سے اجازت چاہی۔ باپ نے خدا حافظ کہا۔ بیٹی باہر گاڑی تک میرے ساتھ آئی۔ میں نے برساتی میں جاکر اسے پیار کرنا چاہا، وہ راضی ہو گئی۔ جب سے میں نے پیار و محبت کا سلسلہ شروع کیا تھا مجھے ایسے ان گنت بوسے یاد ہیں۔ مگر ان میں سے کسی میں مجھے اتنا لطف نہ آیا تھا، نہ کسی نے میرے حافظے پر ایسی دل نواز یاد چھوڑی۔

برسوں گزر گئے، ایک بار پھر میرا اسی راستے پر سے گذر ہوا۔ مجھے داروغہ کی لڑکی یاد تھی۔ اس سے دوبارہ ملنے کا خیال بڑا خوش آئند تھا۔ پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ کون جانے داروغہ اب کہاں ہو؟ کیا خبر اسے نوکری سے ہٹا دیا گیا ہو؟ کیا پتہ دونیا کی شادی ہو چکی ہو۔ نہ جانے دونوں زندہ بھی ہیں یا نہیں؟ اور اس خیال سے میرا دل غمگین ہو گیا، یہی سوچتا ہوا میں «خ» کی چوکی تک پہونچا۔

میری گاڑی گھوڑوں کی چوکی کے داروغہ کے چھوٹے سے مکان کے سامنے رکی۔ کمرے میں گھستے ہی میں نے دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کو پہچان لیا۔ وہی «مسرف بیٹے» کی کہانی کے متعلق تھیں۔ پلنگ اور میز پرانی جگہہ پر

تھے۔ مگر کھڑکی کے چھجے پر پھول نہیں تھے۔ کمرے کی ہر چیز سے غفلت اور بوسیدگی ٹپک رہی تھی۔ گھوڑوں کی چوکی کا داروغہ ایک طرف بھیڑ کی کھال کا کوٹ اوڑھے سو رہا تھا۔ میرے آنے پر وہ جاگ اٹھا۔ تھا تو وہ سمسون ویرن ہی مگر افوہ کس قدر معمر ہو چکا تھا! اس نے میرے حکم‌نامے کی نقل کرنی شروع کی تو میں نے دیکھا کہ اس کے سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ داڑھی بڑھے ہوئے چہرے پر گہری گہری لکیریں پڑ چکی تھیں۔ شانے جھک گئے تھے۔ میں حیران تھا کہ تین چار سال کے عرصہ میں یہ تندرست و توانا شخص کس طرح اس قدر کمزور اور معمر ہو گیا۔ «ارے تم مجھے پہچانے بھی؟» میں نے پوچھا۔ «میں تمہارا پرانا دوست ہوں۔» «ہاں ہونگے» اس نے بیدلی سے جواب دیا «اس راستے سے بہت مسافر گزرتے ہیں۔» «اب تمہاری بیٹی دونیا کا کیا حال ہے؟» میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ بڑے میاں نے تیوری چڑھا کر جواب دیا «خدا جانے۔» میں نے پھر پوچھا «تو کیا اس کی شادی ہو گئی ہے؟» بڑے میاں نے ایسا ظاہر کیا گویا انہوں نے میری بات سنی ہی نہیں اور اسی طرح دھیمی آواز میں حکم‌نامہ پڑھتے رہے۔ یہ دیکھکر میں نے اور سوال کرنے مناسب نہ سمجھے اور کیتلی گرم کرنے کو کہا۔ میرا تجسس کا جذبہ بیدار ہو چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ پنچ (شراب) کے ایک گلاس سے میرے بوڑھے دوست کی زبان کھل جائے گی۔

میرا اندازہ کچھہ غلط نہ تھا۔ بڑے میاں نے شراب کا گلاس قبول کر لیا۔ اسے پیتے ہی ان کی افسردگی کم ہو گئی۔ دوسرے گلاس سے زبان بھی کھل گئی۔ اور انہوں نے مجھے پہچان بھی لیا یا کم سے کم ظاہر یہی کیا کہ انہیں میں یاد ہوں۔ ان کی زبانی میں نے جو کہانی سنی اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا۔

«تو آپ بھی میری دونیا کو جانتے تھے؟ ارے کون ایسا تھا جو اسے نہ جانتا ہو۔ وہ لڑکی تھی ہی ایسی۔ دونیا! دونیا! ہائے کیا لڑکی تھی! جو یہاں آتا اس کی تعریف کرتا ہوا جاتا۔ کوئی ایسا نہ تھا جس نے کبھی اس کے خلاف کچھہ کہا ہو۔ خواتین آتیں تو اسے تحفے تحائف دے جاتیں۔ سر کا قصابہ، کانوں کے بندے۔ امرا گذرتے تو اس طرح یہاں رک جاتے گویا ان کو کوئی کام ہے یا کھانا کھانا ہے۔ مگر اصل میں ان کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ اس کو کچھہ دیر اور دیکھتے رہیں۔ چاہے کسی کو کتنا ہی غصہ چڑھا ہو مگر اس کو دیکھتے ہی طوفان اتر جاتا اور وہ مجھہ سے نرمی سے بات کرنے لگتا۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے مگر یہ بالکل سچ بات ہے کہ سرکاری ہرکارے اور قاصد آدھہ آدھہ گھنٹے تک اس سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ میری تو ساری گھرداری اسی کے سہارے چلتی تھی۔ اسے گھر صاف کرنے، سجانے، کھانا پکانے، ہر چیز کا بڑا سلیقہ تھا۔ اور میں؟ احمق پیر فرتوت اس کو دیکھہ دیکھہ کر خوش ہوتا تھا۔ خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا۔ کیا مجھے اپنی بچی سے محبت نہ تھی، کیا میں اس

کی قدر نہ جانتا تھا؟ ہر طرح اسے آرام پہچانے کی کوشش نہ کرتا تھا؟ مگر آسمانی مصیبتوں کو دعاؤں سے نہیں ٹالا جا سکتا۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے؟» یہاں اس نے اپنی مصیبت کی پوری داستان سنائی جو یہ تھی۔

تین سال پہلے کی بات ہے۔ داروغہ ایک نئے رجسٹر میں لائنیں کھینچ رہا تھا اور اس کی بیٹی پردے کے پیچھے بیٹھی اپنے کپڑے سی رہی تھی۔ اتنے میں تین گھوڑوں کی ایک گاڑی آکر رکی۔ اس میں سے ایک مسافر سر پر چرکیسی ٹوپی اوڑھے، لمبا سا فوجی کوٹ پہنے، گلے میں مفلر لپیٹے کمرے میں داخل ہوا، اور آتے ہی گھوڑوں کا مطالبہ کیا۔ اس وقت گھوڑوں کی چوکی میں ایک بھی گھوڑا نہ تھا۔ یہ سنتے ہی مسافر غصے سے گرجنے لگا۔ اور داروغہ کو مارنے کے لئے چابک اٹھایا۔ دونیا جو ایسے بہت سے منظر دیکھ چکی تھی پردے کے پیچھے سے دوڑتی ہوئی آئی اور بڑی دلربائی سے مسافر سے چائے پینے کو پوچھنے لگی۔ دونیا کو دیکھتے ہی مسافر کا غصہ فرو ہو گیا، اور وہ گھوڑوں کے لئے انتظار کرنے پر راضی ہو گیا اور کھانا لانے کا حکم دیا۔ بھیگی ہوئی سمور کی ٹوپی، مفلر اور لمبا کوٹ اتارنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ایک کشیدہ قامت نوجوان فوجی افسر تھا۔ وہ بہت جلد گھل مل گیا اور داروغہ اور اس کی بیٹی سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا۔ کھانا میز پر چن دیا گیا۔ اسی دوران میں گھوڑے بھی آ گئے، داروغہ نے گھوڑوں کو مسافر کی سلج میں جوتنے کا حکم دے دیا۔ مگر جب وہ واپس کمرے میں

پہونچا تو اس نے دیکھا کہ نوجوان افسر بنچ پر نیم بےہوش پڑا تھا۔ اس کے سر میں شدید درد تھا اور غشی محسوس ہو رہی تھی غرض یہ کہ وہ اس قابل نہ تھا کہ سفر کر سکے۔ اب کیا ہوا؟.. داروغہ نے اپنا پلنگ اسے دیدیا اور یہ طے ہوا کہ اگر وہ اگلے دن تک تندرست نہ ہوا تو اس کے علاج کے لئے شہر «س» سے معالج کو بلوایا جائیگا۔

اگلے دن نوجوان کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ اس کا نوکر پاس کے شہر سے ڈاکٹر کو لانے گیا۔ دونیا نے سرکے میں رومال ڈبو ڈبوکر اس کے ماتھے پر رکھا اور پلنگ کے قریب سلائی لیکر بیٹھ گئی۔ مریض داروغہ کے سامنے مستقل کراہتا رہا گو منہہ سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ مگر در پیالی کافی پی اور کراہ کراہ کر کھانا لانے کو کہا۔ دونیا لمحہ بھر کو بھی اس کے پہلو سے نہ ہٹی۔ وہ باربار پیاس کی شکایت کرتا۔ اس لئے دونیا اپنے ہاتھہ سے لیمو کی شکنجبین بنا کر لائی۔ مریض باربار شکنجبین سے اپنے ہونٹ تر کرتا اور ڈونگا واپس کرتے ہوئے دونیا کا ہاتھہ اپنے کمزور ہاتھہ میں لیکر احسان مندی ظاہر کرنے کو دباتا۔ ڈاکٹر کھانے کے وقت تک پہونچ گیا۔ اس نے مریض کی نبض دیکھی اور اس سے جرمن میں کچھہ بات چیت کی۔ پھر روسی میں کہا کہ اسے فقط آرام کی ضرورت ہے، چند ہی دنوں میں وہ سفر کے قابل ہو جائیگا۔ فوجی افسر نے پچیس روبل فیس کے طور پر پیش کئے اور اپنے ساتھہ کھانا کھانے کو کہا۔ ڈاکٹر نے دعوت بخوشی قبول کر لی۔ دونوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ ایک

بوتل شراب پی۔ دونوں بہت خوش اور مطمئن معلوم ہوتے تھے۔

یوں ہی ایک دن اور گزر گیا۔ افسر بالکل تندرست ہو گیا۔ وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔ کبھی دونیا، کبھی داروغہ سے ہنسی مذاق کرتا، کبھی سیٹیاں بجاتا، کبھی مسافروں سے گپ مارتا۔ ان کے پروانہ راہداری کا اندراج رجسٹر میں کرتا۔ یہاں تک کہ نیک دل داروغہ اس سے اتنا خوش ہو گیا کہ منٹ بھر کو بھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہ کرنا چاہتا۔ اگلے دن اتوار تھا۔ دونیا چرچ جانے کو تیار ہوئی، اتنے میں فوجی افسر کی سلج بھی آ گئی۔ اس نے داروغہ سے رخصت چاہی، اتنے دنوں کی میزبانی کا دل کھول کر معاوضہ دیا۔ دونیا کو خدا حافظ کیا اور پھر اسے اپنے ساتھ سلج میں چرچ تک پہنچا دینے کی تجویز کی، کیونکہ چرچ گاؤں کے دوسرے سرے پر تھا۔ دونیا کچھ چپ سی ہو گئی، تو اس کے باپ نے کہا «تم بھی عجیب لڑکی ہو، آخر تمہیں کیا ڈر ہے؟ عالی جاہ کوئی بھیڑیا تھوڑے ہی ہیں جو تمہیں کھا جائینگے۔ جاؤ تمہیں چرچ تک چھوڑ دینگے۔» دونیا سلج میں فوجی کے پاس بیٹھ گئی، نوکر اچھل کر سامنے کی نشست پر ہو بیٹھا، ڈرائیور نے سیٹی بجائی اور گھوڑے سرپٹ روانہ ہو گئے۔

بدقسمت داروغہ کی آج تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس دن اسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ کس طرح ایسا اندھا ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی دونیا کو فوجی کے ساتھ جانے دیا۔ مگر آدھا ہی گھنٹہ گزرا تھا کہ اس کے دل میں عجب بےچینی اور اضطراب

محسوس ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ اس کی پریشانی اس قدر بڑھی کہ وہ دونیا کو لینے چرچ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچ کر اس نے دیکھا کہ لوگ گرجا سے نکل رہے ہیں۔ مگر دونیا نہ چرچ کے باہر تھی، نہ برساتی میں۔ وہ تیزی سے اندر گھسا، پادری منبر سے اتر کر جا چکا تھا۔ محافظ گرجا شمعیں بجھا رہا تھا۔ دو بوڑھی عورتیں کونے میں سر جھکائے دعا مانگ رہی تھیں۔ مگر دونیا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بدنصیب باپ نے بہ مشکل محافظ گرجا سے پوچھا کہ کیا دونیا عبادت کے وقت گرجا میں تھی؟ اس نے انکار کیا۔ داروغہ نیم جان گھر واپس آیا۔ اب صرف ایک امید باقی تھی کہ شاید دونیا جوانی کی ترنگ میں سلج میں بیٹھے بیٹھے اگلی چوکی تک چلی گئی ہو جہاں اس کی دینی ماں رہتی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں ان گھوڑوں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا، جو اس نے دونیا کا حال معلوم کرنے کے لئے ڈاک کے ساتھہ بھیجدئے تھے۔ سارا دن گزر گیا مگر گاڑی بان واپس نہ آیا۔ آخر رات گئے وہ شراب کے نشے میں بدمست یہ وحشت بھری خبر لیکر آیا کہ «دونیا اگلے اسٹیشن سے فوجی کے ساتھہ اور آگے چلی گئی»۔

غریب داروغہ پر اس خبر سے گویا بجلی گر پڑی۔ وہ اسی دن سے بیمار ہو گیا۔ اور اسی پلنگ پر پڑ گیا جہاں ایک دن پہلے وہ حیلہجو نوجوان مکر کئے لیٹا تھا۔ جب داروغہ نے سب واقعات پر غور کیا تو اسے یقین ہو گیا کہ نوجوان کی بیماری سراسر دھوکہ تھی۔ ہر وقت سوچتے سوچتے اس پر دماغی بخار کا زبردست حملہ ہوا۔ علاج کے لئے اسے

شہر «س» لیجایا گیا۔ اور کوئی اور داروغہ عارضی طور پر اس کی جگہہ مقرر کر دیا گیا۔ شہر میں اس کا معالج وہی ڈاکٹر تھا جو چند دن پہلے نوجوان فوجی کا علاج کرنے گیا تھا۔ اس نے داروغہ کو بتایا کہ فوجی کو کوئی بیماری نہیں تھی۔ محض مکر تھا۔ اور وہ اسی وقت اس کے بدارادے کو بھانپ گیا تھا۔ مگر اس کے چابک کے خوف سے داروغہ کو کچھہ نہ بتا سکا۔ نہ جانے جرمن ڈاکٹر سچ بول رہا تھا یا داروغہ پر محض اپنی فراست کا رعب جمانا چاہتا تھا۔ بہر حال اس اطلاع سے داروغہ کو خاک تسلی نہ ہوئی۔ کچھہ بہتر ہوتے ہی اس نے شہر «س» میں اپنے حکام بالا سے دو ماہ کی چھٹی لی، اور کسی کو اپنے ارادہ کی اطلاع دئے بغیر وہ بیٹی کی تلاش میں چل پڑا۔ رجسٹر کے اندراج سے اسے اتنا معلوم تھا کہ کپتان مینسکی سمولنسک سے پیٹرزبرگ جا رہا تھا۔ کوچوان نے اسے بتایا تھا کہ دونیا سارے راستے روتی رہی تھی۔ حالانکہ وہ اپنی رضامندی سے گئی تھی۔ داروغہ نے سوچا «خدا نے چاہا تو میں اپنی بہکی ہوئی بھیڑ کو واپس گھر لے آؤنگا۔» اسی خیال میں مگن وہ پیٹرزبرگ پہنچا۔ وہاں اسمعیلوف رجمنٹ کی بارکوں میں اپنے ایک پرانے فوجی ساتھی کے ہاں ٹھیرا جو ایک معمولی ریٹائرڈ شدہ افسر تھا۔ اور دونیا کی تلاش شروع کر دی۔ اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ کپتان مینسکی پیٹرزبرگ میں دیموتوف کی سرائے میں رہتا ہے۔ داروغہ نے اس سے ملنے کی ٹھان لی۔

اگلے روز سویرے ہی وہ مینسکی کی رہائش کے بیرونی دروازے پر پہنچا، اور اس کے نوکر سے کہا کہ ایک بوڑھا سپاہی اس کے آقا سے ملنے کا خواہشمند ہے۔ نوکر نے جو سواری کا بوٹ فرمے پر چڑھائے پالش کر رہا تھا، کہا کہ آقا ابھی تک سو رہے ہیں اور گیارہ بجے تک کسی سے ملتے جلتے نہیں۔ داروغہ واپس چلا گیا اور وقت معینہ پر لوٹ آیا۔ مینسکی ڈریسنگ گون اور سرخ ترکی ٹوپی پہنے خود اس سے ملنے آیا۔ «کیوں بھائی میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟» اس نے پوچھا۔ داروغہ کا دل جذبات کی شدت سے امنڈ آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے، منہ سے بس اتنا نکلا «حضور! جناب عالی! خدا کے لئے... حضور!» مینسکی نے اس پر ایک تیز سی نگاہ ڈالی، اور اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ «حضور عالی! جو گیا وہ تو اب کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ مگر میری غریب بچی کو مجھے واپس دیدیجئے۔ آپ نے اپنا شوق پورا کر لیا۔ اب اسے اور تباہ نہ کیجئے۔» نوجوان نے متاثر ہو کر جواب دیا «بیشک جو ہو چکا سو ہو چکا، میں تمہارا قصوروار ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں، مگر میں دونیا کو نہیں چھوڑ سکتا، میں تم سے اپنی عزت کی قسم کھا کر اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ وہ خوش رہیگی۔ اچھا تم اسے واپس لے جا کر کیا کروگے؟ اسے مجھ سے محبت ہے۔ اب وہ اپنی پرانی زندگی دوبارہ اختیار نہیں کر سکتی۔ جو واقعہ ہو چکا ہے نہ تم ہی اسے

بھلا سکوگے نہ وہ ۔» پھر اس نے داروغہ کی آستین میں کچھہ ٹھونستے ہوئے دروازہ کھولا، اور اس سے پہلے کہ وہ کچھہ سوچ سمجھہ سکے داروغہ سڑک پر تھا ۔

کچھہ دیر تک تو وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑا رہا، پھر اس نے محسوس کیا کہ کف کے نیچے کاغذوں کا پلندہ سا ہے، نکال کر دیکھا تو پچاس روبل کے مڑے ہوئے بہت سے نوٹ تھے ۔ ان کو دیکھہ کر اس کی آنکھوں سے شرم اور غصے کے مارے برسات برسنے لگی ۔ اس نے نوٹوں کو توڑ مروڑ کر ان کا گولہ سا بنا کر زمین پر پٹخ دیا، پھر اسے پاؤں سے خوب روندا اور آگے چلدیا ۔ مگر کچھہ دور چل کر رک گیا، اور پھر وہ سوچنے لگا ۔ واپس آیا تو نوٹوں کا گولہ غائب تھا ۔ ایک خوش پوش نوجوان اس کو دیکھتے ہی ایک گاڑی کی طرف لپکا اور اس میں بیٹھہ کر کوچوان سے بولا «جلدی چلو!» مگر داروغہ نے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ اس نے اپنے کام پر واپس جانے کا ارادہ کر لیا ۔ مگر جانے سے پہلے وہ ایک بار اپنی بچی کو دیکھنا چاھتا تھا ۔ چنانچہ دو دن بعد پھر وہ مینسکی کے گھر گیا ۔ مگر اس دفعہ فوجی نوکر نے یہ کہکر کہ اس کا آقا کسی سے ملتا نہیں دروازہ جھٹ سے بند کر دیا ۔ داروغہ دیر تک باھر کھڑا رہا اور پھر واپس چلا گیا ۔

اسی شام کو وہ لتی‌نایا سڑک پر گھوم رہا تھا جہاں وہ شہیدوں کے چرچ میں عبادت کر چکا تھا ۔ کہ اتنے میں ایک بڑی شاندار گاڑی اس کے پاس سے تیزی کے ساتھہ گزر گئی ۔

داروغہ نے مینسکی کو پہچان لیا ۔ گاڑی ایک تین منزلہ مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی ۔ مینسکی کود کر برساتی میں چلا گیا ۔ داروغہ کو ایک ترکیب سوجھی ۔ گاڑی کے قریب پہنچکر اس نے کوچوان سے پوچھا «کیوں بھائی یہ گاڑی کس کی ہے؟ کہیں مینسکی کی تو نہیں ہے؟» «ہاں ہاں انہیں کی ہے» کوچوان نے جواب دیا ۔ «مگر تم کیوں پوچھتے ہو؟» «میں اس لئے پوچھتا ہوں کہ تمہارے آقا نے مجھے ایک پرچہ دیا تھا کہ میں ان کی دونیا کو پہنچا دوں ۔ مگر میں بدقسمتی سے یہ بھول گیا کہ وہ کہاں رہتی ہے ۔» «اسی مکان میں دوسری منزل پر رہتی ہے ۔ مگر بھیا اب تمہارا پرچہ پہنچانا بیکار ہے ۔ آقا خود اس وقت اس کے پاس گئے ہیں ۔» «کچھ پرواہ نہیں» داروغہ کا دل عجب طرح دھڑکنے لگا ۔ «تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے ٹھیک جگہ بتا دی ۔ مجھے تو اپنا کام کرنا ہی ہے ۔» یہ کہکر وہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگا ۔

دروازہ مقفل تھا ۔ اس نے گھنٹی بجائی ۔ کچھ دیر تک امید و بیم میں غوطے لگاتا رہا ۔ قفل میں کنجی گھومنے کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا ۔ «کیا اودوتیا سمسونوونا یہیں رہتی ہیں؟» اس نے پوچھا ۔ «ہاں» نوجوان خادمہ نے جواب دیا ۔ «آپ کو ان سے کیا کام ہے؟» داروغہ جواب دئے بغیر ہی ہال میں داخل ہو گیا ۔ «آپ اندر نہیں جا سکتے!» ملازمہ نے اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے کہا «اودوتیا سمسونوونا اس وقت اکیلی نہیں ہیں ۔» مگر داروغہ نے ایک نہ سنی اور آگے

بڑھتا گیا ۔ شروع کے دو کمروں میں اندھیرا تھا، تیسرے میں روشنی ہو رہی تھی ۔ وہ اس کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا، مگر ایکدم ٹھٹھک گیا ۔ مینسکی نفیس فرنیچر سے آراستہ کمرے میں کسی سوچ میں غرق بیٹھا تھا ۔ دونیا بہت فیشن ایبل لباس پہنے اس کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھی تھی، جیسے انگریزی انداز میں ایک رخی کاٹھی پر سواری کر رہی ہو ۔ وہ محبت بھری نگاہ سے مینسکی کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ اس کے سیاہ گھنگریالے بالوں کو اپنی انگلیوں کے گرد لپیٹ رہی تھی ۔ اس کی انگلیوں میں جڑاؤ انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں ۔ غریب داروغہ! اس کو اپنی بیٹی کبھی اتنی خوبصورت نہ لگی تھی ۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی بے اختیار تعریفی نظروں سے اسے دیکھتا رہا ۔ «کون ہے؟» دونیا نے سر اٹھائے بغیر پوچھا ۔ وہ گم سم بت بنا کھڑا رہا ۔ جواب نہ ملا تو دونیا نے سر اٹھا کر دیکھا... نظر پڑتے ہی چیخ مار کر قالین پر گر پڑی ۔ مینسکی گھبرا کر اسے اٹھانے کو جھکا مگر دروازے کے قریب داروغہ کو کھڑا دیکھ کر اس نے دونیا کو چھوڑ دیا اور غصے سے کانپتے ہوئے اس کی طرف جھپٹا ۔ «کیا چاہئے تمہیں؟» اس نے دانت پیستے ہوئے کہا ۔ «تم چوروں کی طرح میرے پیچھے پیچھے کیوں پھرتے ہو؟ کیا میری جان لینا چاہتے ہو؟ نکل جاؤ یہاں سے!» اس نے بوڑھے کے کوٹ کا کالر اپنے مضبوط ہاتھ سے پکڑ کر اسے باہر سیڑھیوں تک دھکیل دیا ۔

بوڑھا اپنے قیام گاہ پر واپس آیا ۔ اس کے دوست نے عدالتی چارہ جوئی کرنے کی صلاح دی ۔ مگر داروغہ نے سوچ بچار

کرنے کے بعد اس خیال کو رد کر دیا اور یہی فیصلہ کیا کہ معاملے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔

دو دن بعد وہ پیٹرزبرگ چھوڑ کر اپنی گھوڑوں کی چوکی پر واپس آ گیا اور اپنے روزمرہ کے فرائض میں مشغول ہو گیا۔ «اس واقعہ کو تین سال گزر چکے ہیں» اس نے کہانی کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ «تب سے میں دونیا کے بغیر زندگی گزار رہا ہوں۔ اس عرصہ میں مجھے اس کے متعلق ایک حرف بھی معلوم نہیں ہوا۔ خدا جانے زندہ بھی ہے یا مر گئی۔ ایسی صورت میں کچھ نا ممکن نہیں۔ وہ نہ پہلی لڑکی ہے نہ آخری جسے اس طرح کسی راہ چلتے منچلے نوجوان نے اغوا کیا اور کچھ دنوں داشتہ بنا کر چھوڑ دیا۔ پیٹرزبرگ میں اس جیسی نہ جانے کتنی احمق لڑکیاں ہوں‌گی جو آج تو مخمل اور اطلس میں ملبوس ہیں اور کل... آپ دیکھیں‌گے کہ اور گرے پڑے لوگوں کے ساتھ چوراہوں پر جھاڑو دیتی نظر آئیں‌گی۔ کبھی کبھی جب مجھے خیال آتا ہے کہ دونیا بھی اسی طرح اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی ہوگی تو میرے دل میں یہ گنہگارانہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش وہ مر چکی ہوتی...»

یہ کہانی تھی جو میرے بوڑھے دوست نے نہ جانے کتنی بار آنسو پونچھ پونچھ کر سنائی۔ وہ دمیترئیو کے نفیس نرتیہ ناٹک کے پر جوش ترینتیچ (۱۱) کی طرح آنسوؤں کو بڑی شان سے اپنے کوٹ کے دامن سے پونچھتا جاتا تھا۔ آنسوؤں کی ایک وجہ شراب کے وہ پانچ گلاس بھی تھے جو کہانی سنانے کے دوران میں اس نے یکے بعد دیگرے خالی کئے۔ مگر میرے دل

پر ان آنسوؤں کا بہت اثر ہوا اور اس سے رخصت ہونے کے بعد دیر تک میں اس کا اور بدنصیب دونیا کا خیال اپنے ذہن سے نہ نکال سکا۔

کچھہ عرصہ ہوا کہ میرا گزر پھر شہر «خ» سے ہوا، مجھے اپنا پرانا دوست یاد آیا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ گھوڑوں کی چوکی جہاں اس کا ایک زمانے میں راج تھا اب موجود نہ تھی۔ مگر کوئی اس سوال کا جواب ٹھیک سے نہ دے سکا کہ بوڑھا داروغہ زندہ ہے یا نہیں۔ مجھے ان جانے پہچانے مقامات کو پھر سے دیکھنے کی ایسی زبردست خواہش ہوئی کہ میں نے سات روبل میں گھوڑے کرایہ پر لئے اور «ن» گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

خزاں کا دور دورہ تھا۔ آسمان پر خاکستری بادل چھائے ہوئے تھے۔ اناج سے خالی کھیتوں کی طرف سے ٹھنڈی ہوا درختوں کے سرخ و زرد پتے اڑائے لئے آ رہی تھی۔ سورج کے غروب ہوتے ہوتے میں گاؤں میں پہونچ گیا۔ اور گھوڑوں کی چوکی کے گھر کے سامنے رک گیا۔ ایک موٹی سی عورت اندر سے نکل کر برساتی میں آئی۔ (ہائے یہیں ایک دن دونیا نے مجھے پیار کیا تھا!) عورت نے میرے سوال کے جواب میں کہا کہ بوڑھا داروغہ سال بھر ہوئے انتقال کر چکا ہے، اسکا گھر اب ایک شراب کشید کرنے والےکے پاس ہے اور وہ خود اس کی بیوی ہے۔ مجھے سفر کی زحمت اور سات روبل کا خرچہ رائگاں معلوم ہوا۔ میں نے پھر پوچھا «اس کو کیا عارضہ ہوا تھا؟» «عارضہ تو کچھہ نہیں۔ اس نے تو شراب کے پیچھے

اپنی جان کھوئی۔» «اور دفن کہاں ہوا؟» «گاؤں کے دوسرے سرے پر اپنی بیوی کے پاس۔» «کیا کوئی مجھے اس کی قبر تک لے جا سکتا ہے؟» «ہاں ہاں کیوں نہیں۔ اے وانکا چھوڑ اس بلی کو اور ان صاحب کو قبرستان لے جاکر داروغہ کی قبر کا پتہ بتا دے۔»

ایک کانا لڑکا پھٹے پرانے کپڑے پہنے دوڑتا ہوا اندر سے آیا اور مجھے اپنے ساتھ گاؤں کے دوسرے سرے تک لے گیا۔

«کیا تم جانتے تھے گھوڑوں کی چوکی کے داروغہ کو؟» میں نے اسے راستے میں پوچھا۔

«ہاں خوب اچھی طرح، انہوں نے مجھے سیٹیاں بنانی سکھائی تھیں۔ اور جب وہ شراب کی دکان سے نکلتے تھے تو ہم لڑکے ان کے پیچھے پیچھے چلاتے تھے «چاچا! چاچا! ہمیں میوہ دو!» اور وہ ہمیں ڈھیر سا میوہ دے دیتے۔ وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ کھیلتے تھے۔»

«کیا اور مسافر بھی ان کے بارے میں پوچھتے ہیں؟»

«اب اس طرف زیادہ مسافر آتے ہی نہیں، سوائے محکمہ آب کاری کے جج کے اور وہ کبھی مر جانے والوں کے متعلق نہیں سوچتے۔ مگر اس سال گرمی میں ایک خاتون آئی تھیں۔ انہوں نے داروغہ کو پوچھا اور پھر ان کی قبر دیکھنے گئیں۔»

«خاتون؟ کس قسم کی خاتون؟» میں نے تجسس سے پوچھا۔

«بڑی ھی خوبصورت تھیں۔ چھہ گھوڑوں کی گاڑی میں سوار تھیں۔ اور ساتھہ میں تین بچے اور ان کی آیا اور ایک چھوٹا سا کالا کتا تھا۔ جب ان سے کہا کہ داروغہ مر چکے ھیں تو رونے لگیں۔ بچوں سے کہا کہ «تم چپ چاپ یہاں ٹھہرو۔ میں ذرا قبرستان ھو آؤں۔» میں نے کہا «چلو میں راستہ دکھا دوں۔» تو بولیں «میں سب راستے جانتی ھوں» اور پھر مجھے ایک چاندی کا پانچ کوپک کا سکہ دیا۔ بڑی ھی اچھی خاتون تھیں!»

اس عرصہ میں ھم قبرستان تک پہونچ چکے تھے۔ بڑی غم گین اور ویران جگہہ تھی۔ چاروں طرف باڑ تک نہ تھی۔ جگہہ جگہہ لکڑی کی صلیبیں آویزاں تھیں۔ دھوپ کی تیزی سے بچنے کو سایہ تک نہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ پرحسرت قبرستان نہ دیکھا تھا۔

«یہ ھے بوڑھے داروغہ کی قبر» لڑکے نے مٹی کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جس پر ایک سیاہ صلیب لگی تھی جس میں پیتل کی شبیہہ لٹکی ھوئی تھی۔

«کیا وہ خاتون بھی یہاں آئی تھیں؟»

«اور کیا؟» وانکا نے جواب دیا۔ «میں نے دور کھڑے ھو کر دیکھا تھا کہ وہ بہت دیر تک یہاں پڑی رھیں اور پھر گاؤں واپس گئیں اور پادری کو بلایا اور کچھہ روپیہ دیا... اور مجھے پانچ کوپک دئے۔ بڑی اچھی خاتون تھیں...»

میں نے بھی بچے کو پانچ کوپک کا سکہ دیا۔ اب مجھے یہاں تک سفر کرنے اور سات روبل خرچ کرنے کا ذرا بھی افسوس نہ تھا۔

بہروپ

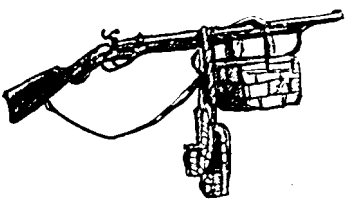

«تم ہر لباس میں حسین و دلکش
نظر آتی ہو میری دلربا!» (۱۲)

بوگدانووچ

ایوان پتروووچ بیرستوف کی جاگیر ایک دور افتادہ صوبے میں واقع تھی ـ جوانی میں انہوں نے محافظ دستے میں خدمات انجام دیں ـ مگر ۱۷۹۷ء میں انہوں نے فوجی نوکری کو خیرباد کہا ـ اور اپنے علاقے پر مستقل سکونت اختیار کر لی ـ ان کی بیوی ایک غریب مگر اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی ـ بچے کی ولادت کے وقت اس کا انتقال ہو گیا ـ ایوان پتروووچ اس روز شکار پر گئے ہوئے تھے ـ اس لئے یہ حادثہ ان کی غیر حاضری میں ہوا ـ بیوی کے صدمے کو انہوں نے علاقہ کی

دیکھہ بھال اور جائداد کے انتظام میں مصروف ہو کر بھلانے کی کوشش کی ۔ اپنا پرانا مکان نئے سرے سے اپنی پسند کا تعمیر کرایا ۔ اپنے علاقہ میں کپڑے کا کارخانہ کھولا ۔ اس طرح ان کی آمدنی دن بدن بڑھتی گئی ۔ اور وہ اپنے کو علاقہ کا سب سے عقلمند آدمی سمجھنے لگے ۔ ان کی اس خوش فہمی کو پختہ کرنے میں ان کے چاپلوس پڑوسیوں کا بھی کچھہ ہاتھہ تھا ۔ یہ لوگ اکثر اپنے کنبوں بلکہ کتوں سمیت آکر کئی کئی دن ایوان پتروویچ کے مہمان رہتے اور موقعہ بےموقعہ ان کی تعریف کرتے رہتے ۔ ایوان پتروویچ روز مرہ کام کاج کے وقت نقلی مخمل کی صدری پہنتے اور چھٹی کے دن ہاتھہ کے عمدہ بنے ہوئےکپڑے کا فراک کوٹ ۔ خود اپنا حساب کتاب رکھتے ۔ اخبار میں صرف سینیٹ کی کارروائی کے متعلق خبریں پڑھتے ۔ مجموعی طور پر سب لوگ انہیں پسند کرتے تھے اگرچہ بعض لوگ انہیں مغرور اور خود پسند سمجھتے تھے ۔ گریگوری ایوانووچ مورومسکی ان کا سب سے قریبی پڑوسی تھا ۔ اور صرف وہی ایک ایسا آدمی تھا جس سے ان کے تعلقات خوشگوار نہ تھے ۔ مورومسکی پرانی طرز کا روسی جاگیردار تھا ۔ اس نے اپنی مال و دولت کا بڑا حصہ فضول خرچیوں میں اڑا دیا تھا ۔ بیوی کی موت کے بعد وہ بھی ماسکو چھوڑکر اپنے گاؤں میں آبسا کیونکہ ساری جائداد میں سے بس یہی گاؤں باقی بچ رہا تھا ۔ یہاں بھی اس نے دولت اڑانے کا سلسلہ ذرا مختلف انداز میں جاری رکھا ۔ اس نے اپنے مکان کے سامنے انگریزی طرز کا باغ لگایا، جس پر رہی سہی پونجی خرچ

ہو گئی۔ اس کے اصطبل میں کام کرنے والے لڑکے انگریزی سائیسوں جیسا لباس پہنتے۔ بیٹی کی تعلیم کے لئے انگریز گورنس مقرر تھی۔ یہاں تک کہ زمین کی کاشت بھی انگریزی طریقے سے کرتا۔ مگر مثل مشہور ہے کہ روسی اناج کے لئے غیرملکی طریقے موزوں نہیں۔ گریگوری ایوانووچ نے اپنے اخراجات کم کرنے کی بہت کوشش کی۔ مگر کیونکہ آمدنی میں کسی طرح اضافہ نہ ہوا، اس لئے گاؤں میں رہتے ہوئے بھی وہ اور زیادہ مقروض ہو گیا۔ ان سب باتوں کے باوجود لوگ اس کی قابلیت کے قائل تھے کیونکہ وہ پہلا آدمی تھا جس نے اپنی جائداد سرپرستوں کی عدالتی کمیٹی کے ہاتھوں گروی رکھی تھی۔ اور یہ کام بڑا ہی پیچیدہ تھا۔ بعض لوگوں کو اس کی اس حرکت پر اعتراض تھا۔ ان میں سب سے زیادہ کٹر نکتہ چین بیرستوف تھا جسے ہر قسم کی نئی بات ناپسند تھی۔ اسے اپنے پڑوسی کی انگریزیت سے اسقدر چڑ تھی کہ اس کا ذکر وہ ٹھنڈے دل سے نہ کر سکتا تھا۔ ہمیشہ اس میں عیب نکالنے کے درپے رہتا۔ مثلاً جب اپنے مہمانوں کو علاقے کی سیر کراتا اور وہ ان کی خوش انتظامی کی تعریف کرتے تو کہتا «جی ہاں! اصل میں بات یہ ہے کہ ہم لوگ پڑوسی گریگوری ایوانووچ جیسے تو ہیں نہیں کہ انگریزوں کے نقل میں اپنے آپ کو تباہ کر لیں۔ ہمارے لئے تو بس اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے روسی ڈھنگ سے پیٹ بھر سکیں اور عزت کی زندگی گذار سکیں۔» پڑوسیوں کی عنایت سے اس قسم کے سب جملے پھول پھندنے لگاکر گریگوری ایوانووچ

کے کانوں تک پہنچائے جاتے۔ انگریزیت پسند موروسکی بھی ہر قسم کی نکتہ چینی سے ایسے ہی بگڑتے تھے، جیسے ہمارے اخباروالے۔ چنانچہ انہوں نے بھی مارے غصے کے دیہاتی زوئی‌لس بیرستوف کو گنوار، جنگلی ریچھ وغیرہ کے ناشائستہ نام رکھ دئے تھے۔

غرض یہ کہ ان دونوں جاگیرداروں کے تعلقات کافی حد تک کشیدہ تھے کہ اسی زمانے میں بیرستوف کا بیٹا کچھ عرصہ کے لئے اپنے باپ کے پاس رہنے کیلئے آیا۔ اس نے «خ» یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی اور فوج میں بھرتی ہونے کا خواہشمند تھا۔ باپ اس کو فوج میں بھیجنے پر راضی نہ تھا۔ اور صاحب زادے کو یقین تھا کہ وہ سرکاری نوکری کے بالکل اہل نہیں ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ہٹ چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ اسلئے یہ معاملہ ابتک طے نہ ہو سکا تھا۔ اور نوجوان الکسی اپنے باپ کی جاگیر پر ٹھاٹ سے وقت گذار رہا تھا۔ صرف احتیاطاً مونچھیں رکھ لیں تھیں کہ شاید فوج میں جانے کی اجازت مل جائے۔

الکسی بڑا خوش‌رو نوجوان تھا۔ اور اس کے موزوں قد و قامت پر فوجی وردی بہت پھبتی اور اگر کہیں شہسواری کے میدان میں اپنے جوہر دکھانے کی جگہ اسے سرکاری کاغذات پر سر جھکائے جھکائے جوانی بسر کرنی پڑی تو یہ اس کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوگی۔ وہ جب کبھی شکار پر جاتا تو اس کا گھوڑا راستے کی رکاوٹوں کو پھلانگتا ہمیشہ سب سے آگے رہتا۔ اور سب پڑوسی متفق طور پر کہتے «اوں ہوں! یہ لڑکا ہرگز اچھا

سرکاری افسر نہیں بن سکتا ۔ یہ تو فوج کے لئے ہی موزوں ہے ۔» نوجوان لڑکیوں کی پرشوق نگاہیں اکثر اس پر پڑتیں ۔ اور یہی دلچسپی بعض اوقات پسندیدگی میں تبدیل ہو جاتی ۔ مگر الکسی کسی لڑکی کی طرف توجہ نہ کرتا ۔ اور وہ اس کی سرد مہری سے یہ نتیجہ نکالتیں کہ اسے ضرور کسی سے محبت ہے ۔ اس کے ثبوت میں کاغذ کا ایک پرزہ دست بدست گشت کرایا گیا، جس پر اس کے خطوں میں سے ایک کے مکتوب علیہ کا پتہ لکھا تھا جو یہ تھا: اکولینا پتروونا کورچکینا، ماسکو، سینٹ الکسی کی خانقاہ کے متصل پہنچکر ٹھٹھیرے ساویلیو کے مکان پر پہنچے ۔ اور درخواست ہے کہ مہربانی کرکے یہ خط ا ۔ ن ۔ ر ۔ کو پہنچا دیا جائے ۔

ہمارے پڑھنے والوں میں سے جو لوگ دیہات میں نہیں رہے ہیں ان کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ قصباتی لڑکیاں کسقدر من موہنی ہوتی ہیں ۔ دیہات کی کھلی ہوا اور سیبوں کے باغوں کے سایوں میں پل کر سوسائٹی اور زندگی کے متعلق ان کا سارا علم کتابوں کا مرہون منت ہوتا ہے ۔ خاموشی اور تنہائی، آزادی اور کتابیں پڑھنے کا شوق ان میں ان جذبات اور حسیات کی نشوونما کر دیتا ہے، جو ہمارے شہروں کی فیشن زدہ نازنینوں میں عنقا ہیں ۔ ان الھڑ دیہاتی دوشیزاؤں کے لئے گھنٹیوں کی آواز میں ایک عجیب سحر ہے ۔ قریبی شہر کا سفر ان کی زندگی کا یادگار واقعہ ہے ۔ اور کبھی کبھار آنے والے پردیسی ان کے دل پر دیرپا بلکہ کبھی کبھی امٹ نقش چھوڑ جاتے ہیں ۔ بعض لوگ ان لڑکیوں کی نرالی

خصوصیات پر ہنسیں گے۔ مگر ان سرسری نظر سے دیکھنے والوں کی ہنسی ان کی ذاتی خوبیوں پر پردہ نہیں ڈال سکتی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی وہ دلفریب انفرادیت ہے جس کے بغیر ژان پال ریختر کے قول کے مطابق کوئی انسان ممتاز نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ بڑے شہروں میں عورتیں زیادہ تعلیم یافتہ ہوں۔ مگر سوسائٹی کے اثر سے ان کی شخصیت بہت جلد ایک رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دماغ ان کے سر کی پوشش کی طرح یکساں ہو جاتے ہیں۔ اس بات سے نہ کسی پر اعتراض مقصود ہے نہ مقابلہ بلکہ یہ محض ذاتی رائے ہے۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نوجوان الکسی نے ہمارے علاقے کی سادہ دل دوشیزاؤں کو کس حد تک متاثر کیا ہوگا۔ وہ پہلا نوجوان تھا جس کے انداز میں افسردگی تھی اور محرومیوں کی تلخی۔ اس نے خوشی کے تیزپا لمحوں اور شباب کی یاس انگیزیوں کا تذکرہ کیا۔ اور ان سب پر مستزاد یہ کہ اس کی انگلی میں ایک سیاہ انگوٹھی تھی جس پر مردے کی کھوپری منقش تھی۔ اس علاقے میں یہ سب چیزیں اسقدر انوکھی تھیں کہ سب لڑکیاں اس پر دیوانی تھیں۔

مگر الکسی میں سب سے زیادہ دلچسپی انگریزیت پسند مورومسکی کی بیٹی لیزا کو تھی (جسے اسکا باپ بیٹسی کہتا تھا)۔ دونوں کے باپ ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ اس لئے لیزا نے ابتک الکسی کو نہ دیکھا تھا۔ اور آس پاس کی لڑکیاں ہر وقت الکسی ہی کا ذکر کرتی تھیں۔ لیزا کی

عمر سترہ سال کی تھی۔ زیتونی رنگ کے دل کش چہرے پر سیاہ بڑی بڑی آنکھیں روشن تھیں۔ کیونکہ اکلوتی لڑکی تھی اسلئے تھوڑی سی سرکش اور لاڈ پیار میں بگڑی ہوئی ضرور تھی۔ اس کی شوخیاں اور شرارتیں اس کے باپ کو بہت پسند تھیں۔ مگر بیچاری گورنس کے لئے باعث عذاب تھیں۔ اسکی گورنس مس جیکسن چالیس سال کی بے حد سنجیدہ کنواری عورت تھی۔ چہرے پر ڈھیروں پاؤڈر تھوپتی اور بھوئیں بناتی تھی۔ ہر چھٹے مہینے اپنا پسندیدہ ناول «پامیلا» دو بارہ پڑھتی۔ ان سب خدمات کے عوض اس کو دو ہزار روبل سالانہ ملتے تھے۔ وہ اس وحشی ملک روس سے حددرجہ ناراض اور اکتائی ہوئی تھی۔

لیزا کی ایک ملازمہ تھی ناستیا جو عمر میں اس سے ذرا بڑی مگر اپنی مالکہ کی طرح تیز طرار تھی۔ لیزا کو اس سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ اسے اپنے رازوں میں شریک کرتی تھی اور اپنی شرارتوں کو عملی جامہ پہنانے میں اس کی مدد لیتی۔ غرض یہ کہ پری‌لوچنو گاؤں میں فرانسیسی ناولوں کی رازدار کیریکٹروں سے زیادہ اہمیت ناستیا کو حاصل تھی۔

«کیا آج میں باہر کسی سے ملنے جا سکتی ہوں؟» ناستیا نے ایکدن صبح کو اپنی مالکہ کو لباس تبدیل کراتے ہوئے پوچھا۔

«ہاں، ہاں ضرور مگر کہاں جا رہی ہو؟»

«توگی‌لوو گاؤں، بیرستوف کے ہاں۔ ان کے باورچی کی بیوی کا آج جنم دن ہے۔ وہ کل ہمیں کھانے کا بلاوا دینے آئی تھی۔»

«اچھا تو یہ بات؟ دونوں گھروں کے مالکوں میں تو میل ملاپ نہیں اور نوکر ایک دوسرے کی دعوتیں کرتے ہیں ـ ہوں؟»

«ہمیں مالکوں کے جھگڑے میں دخل دینے کی کیا ضرورت؟» ناستیا نے فوراً جواب دیا ـ «اور پھر تو میں تمہاری ملازمہ ہوں، تمہارے ابا کی تھوڑا ہی ہوں ـ اور تمہارا اب تک نوجوان بیرستوف سے کوئی جھگڑا ہوا نہیں ـ بڑے بوڑھے جانیں اور ان کے لڑائی جھگڑے جانیں ـ»

«اچھا ذرا کوشش کر کے الکسی بیرستوف کو دیکھ کر آنا اور آکر مجھے بتانا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے ـ»

ناستیا نے وعدہ کر لیا ـ لیزا سارے دن اپنی ملازمہ کا بےچینی سے انتظار کرتی رہی، جب وہ شام کو واپس آئی تو کمرے میں گھستے ہی بولی:

«لیزاویتا گریگوریونا! آج میں نے بیرستوف کو دیکھ لیا اور دیکھا بھی خوب اچھی طرح کیونکہ تقریباً سارے دن وہ اور ہم ساتھ رہے ـ»

«ہیں! سچ مچ مجھے سارا حال بتاؤ شروع سے!»

«ہاں تو ہم سب اکٹھے وہاں پہونچے ـ میں، انیسیا یوگورونا، ننیلا، دونیا...»

«ہاں ہاں، جانتی ہوں ـ پھر کیا ہوا؟»

«نہیں بھئی ساری بات شروع سے سنانے دیجئے ـ ہاں تو ہم لوگ عین کھانے کے وقت وہاں پہونچے ـ سارا کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، کولیین اور زخاریف کے نوکر

بھی تھے، داروغہ کی بیوی اور بیٹیاں بھی تھیں، خلوپن کے نوکر...»

«مجھے تو بیرستوف کے متعلق بتاؤ۔»

«ارے آپ سنئیے تو سہی۔ ہم لوگ میز کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ داروغہ جی کی بیوی میزبان کے پاس بیٹھیں۔ ان کے پاس میں بیٹھی تھی۔ اس پر ان کی بیٹیوں نے کچھ منہ بنایا۔ مگر میں نے ذرا پرواہ نہ کی۔»

«افوہ! ناستیا تمہیں فضول بکواس کا کتنا شوق ہے!»

«اور آپ؟ کس قدر بے صبر ہیں آپ! ہم لوگ کھانا کھاکر اٹھے۔ کھانا تقریباً تین گھنٹے تک چلتا رہا، ہر چیز بہت مزیدار تھی، رنگ برنگے میٹھے سموسے اور نہ جانے کیا کچھ۔ کھانا کھاکر ہم لوگ باغ میں آنکھ مچولی کھیلنے چلے گئے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ نو عمر آقا بھی وہاں موجود ہے۔»

«کیا یہ سچ ہے کہ وہ بہت خوبصورت ہے؟»

«خوبصورت تو واقعی بہت ہے۔ کشیدہ قامت، سرخ و سفید۔»

«سرخ و سفید؟ اور مجھے نہ جانے کیوں خیال تھا کہ اس کا رنگ زعفرانی ہوگا۔ خیر! اور کیسا لگا وہ؟ اداس؟ فکرمند؟»

«ارے نہیں، بالکل نہیں ایسا منچلا آدمی تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ہم لوگوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔»

«تم لوگوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی؟ کیا کہہ رہی ہو ناستیا؟»

«بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جو کوئی ان کے ہاتھ آ جاتا اسے پیار کرتے۔»

«ارے ناستیا تم کیا من گھڑت باتیں کر رہی ہو!»

«میں کیوں من گھڑت باتیں کرتی۔ میں نے تو بڑی مشکل سے ان سے اپنی جان بچائی۔ سارے دن وہ ہم لوگوں ہی میں رہے۔»

«مگر ہر ایک تو کہتا ہے کہ وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے، اس لئے وہ لڑکیوں کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔»

«بھلے ہی ایسا ہو، مگر میں تو اتنا جانتی ہوں کہ اس نے میری طرف بھی دیکھا۔ داروغہ جی کی لڑکی تانیا کی طرف بھی بلکہ کولبینو پاشا کو بھی معاف نہیں کیا... سچ تو یہ ہے کہ اس نے ایک لڑکی کو بھی نہیں چھوڑا، مشہدہ کہیں کا!»

«حیرت ہے! اچھا وہاں ان سب لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟»

«یہی کہ وہ بہت اچھا آدمی ہے، رحم دل، خوش مزاج اور ہنس مکھ، مگر اس میں ایک ہی خرابی ہے کہ لڑکیوں کے پیچھے پیچھے بہت پھرتا ہے، مگر میرے نزدیک یہ کوئی عیب نہیں۔ عمر کے ساتھ یہ عادت خود بخود چھٹ جائے گی۔»

لیزا نے ٹھنڈی سانس بھری «ہائے مگر میں اسے کس طرح دیکھوں؟»

«ارے یہ کونسی مشکل بات ہے؟ تو گی‌لوو کونسا اتنا دور ہے؟ بس تین کوس ہی ہے۔ چاہو تو ٹہلتے ٹہلتے وہاں جا سکتی ہو یا گھوڑے پر چلی جاؤ کہیں نہ کہیں ضرور اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ وہ روز صبح اپنی بندوق لے‌کر باہر نکل جاتا ہے۔»

«اری میں یہ کیسے کر سکتی ہوں؟ وہ سمجھےگا کہ میں اس سے ملنے کو مری جا رہی ہوں، اور پھر میرے اور اس کے والد کے تعلقات خراب ہیں، ہائے میں تو اس سے کسی طرح بھی نہیں مل سکتی... ارے ناستیا ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے... بتاؤں میں کیا کروں‌گی۔ دھقان لڑکی کا بھیس بدل کر چلی جاؤنگی۔»

«ہاں ہاں یہ ٹھیک رہیگا۔ ایک گاڑھے کا بلاؤز اور صرافان پہن لینا۔ اور بلا جھجھک توگی لوو چلی جانا۔ مجھے یقین ہے کہ بیرستوف تمہیں نظر انداز نہیں کریگا۔»

«اور میں دیہاتی بولی تو بول ہی سکتی ہوں۔ ناستیا، میری پیاری ناستیا، کیا مزے کی ترکیب سوجھی ہے۔» لیزا سونے گئی تو یہی ٹھان‌کر کہ اگلے دن ضرور اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنائیگی۔

چنانچہ اگلے دن بازار سے موٹا نیلے رنگ کا کھدر منگایا اور گلے میں لگانے کو پیتل کے بٹن۔ ناستیا کی مدد سے بلاؤز اور صرافان کاٹا اور سب ملازم لڑکیوں کو سلائی میں لگا لیا۔ شام تک سب چیزیں سل سلاکر تیار ہو گئیں۔ لیزا نے اپنے نئے کپڑے پہن‌کر شیشے میں دیکھا تو ماننا پڑا کہ یہ لباس اس پر بہت پھب رہا تھا۔ اس نے آزمائش کے طور پر دیہاتنوں کی طرح سر کو ادھر ادھر جھٹکایا۔ ان مٹی کی بلیوں کی طرح جن کے سر ہلتے رہتے ہیں۔ اپنے ہاں کی دیہاتی بولی میں بات کی ہنستے ہوئے آستین منہ پر رکھہ لی۔ اس کامیاب نقل کو ناستیا نے بالکل پاس کر دیا۔ مگر

اب ایک اور مشکل تھی کہ صحن میں ننگے پاؤں پھرتے ہوئے نکیلی گھاس بری طرح اس کے پیروں میں چبھ رہی تھی اور بجری اور ریت نرم پاؤں میں بری طرح کاٹنے لگی تھی۔ اسوقت بھی ناستیا اس کے کام آئی۔ اس نے لیزا کے پاؤں کا ناپ لیا اور کھیت میں جاکر تروفیم چرواہے سے دیہاتی جوتے بنانے کو کہا۔ اگلے دن لیزا صبح ہونے سے پہلے اٹھ بیٹھی۔ گھر کے اور لوگ ابھی تک سو رہے تھے۔ ناستیا دروازے پر کھڑی چرواہے کا انتظار کر رہی تھی۔ اتنے میں گجر بجا اور گاؤں بھر کے مویشیوں کے گلے زمیندار کے گھر کے پاس سے گذرنے لگے۔ تروفیم نے جاتے ہوئے ناستیا کو ایک جوڑی شوخ رنگ کی جوتیاں دیں جس کے بدلے میں ناستیا نے پچاس کوپک ادا کئے۔ لیزا نے چپکے سے اپنے دھقانی کپڑے پہنے ناستیا کو مس جیکسن کے سلسلے میں کچھ ہدایات دیں۔ اور پچھلی پرساتی کی طرف سے نکل کر ترکاریوں کے باغ میں ہوتی ہوئی کھیتوں کی طرف نکل گئی۔

مشرق کی طرف پوپھٹ رہی تھی۔ آسمان پر بادل سنہری صفوں میں آراستہ سورج کا انتظار کر رہے تھے۔ گویا درباری زار کے منتظر ہوں۔ شفاف آسمان، صبح کی تازگی، شبنم کے موتیوں کی جگمگاہٹ، سویرے کی نرم خیز ہوا، اور پرندوں کی چہچہاہٹ سے لیزا کا دل طفلانہ خوشی سے بھر گیا۔ اس ڈر سے کہ کوئی جاننے والا نہ مل جائے وہ زمین پر ایسے ہولے ہولے پیر رکھ رہی تھی کہ چلنے کی جگہہ اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب وہ درختوں کے اس جھنڈ تک پہونچی

جو اس کے باپ کے علاقہ کی آخری حد پر تھا تو اس کے قدم سست پڑ گئے۔ اسے یہیں ٹھیر کر الکسی کا انتظار کرنا تھا... اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ مگر یہی دھڑکن اور گھبراہٹ تو ہے جو جوانی کی نادان حرکتوں میں دلکشی کا رنگ بھرتی ہے۔ لیزا درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوئی۔ وہاں ابھی تک دھندلکا باقی تھا۔ دبی دبی آوازیں جو کسی گہرائی میں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اس کے کانوں میں پڑیں۔ اس کی زندہ دلی دب سی گئی اور وہ رفتہ رفتہ شیریں خیالات میں گم ہو گئی۔ وہ سوچ رہی تھی... مگر کون لکھ سکتا ہے کہ ایک سترہ سالہ دوشیزہ بہار کی ایک سنہری صبح کو درختوں کے جھنڈ میں پانچ یا چھ بجے کیا سوچ رہی ہوگی؟ وہ یوں ہی اپنے خیالات میں گم ایک پگڈنڈی پر چل رہی تھی جس کے دونوں طرف لمبے لمبے سائے دار درخت تھے کہ اتنے میں ایک بڑھیا نسل کا کتا بھونکتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ لیزا گھبراکر چیخی۔ عین اسی وقت ایک آواز سنائی دی «بس چپ، سبوگار، ادھر» اور ایک نوجوان شکاری جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ «سندری گھبراؤ نہیں میرا کتا بھونکتا ہے کاٹتا نہیں» اس نے لیزا کو مخاطب کرکے کہا۔ لیزا اب خوف زدہ نہ تھی۔ لیکن اس نے موقعہ سے فائدہ اٹھاکر شرم اور ڈر کے ملے جلے جذبات ظاہر کرتے ہوئے کہا «مگر جناب! مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے، دیکھئے نا کتنا ڈراؤنا کتا ہے، اگر پھر مجھ پر لپکا تو؟» الکسی (امید ہے کہ ناظرین سمجھ گئے ہونگے کہ اجنبی نوجوان کون تھا) نے دیہاتی دوشیزہ

کو چند لمحے تک غور سے دیکھا ۔ «اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہو تو میں تمہارے ساتھہ چلوں؟» اس نے پوچھا ۔ «کیا تم مجھے اپنے ساتھہ آنے کی اجازت دوگی؟» «کون کسی کو روک سکتا ہے؟» لیزا نے اٹھلاکر کہا ۔ «سڑک تو سبھی کے چلنے کے واسطے ہے ۔» «تم کہاں رہتی ہو؟» «پری لوچنو میں ۔ میں واسیلی لوہار کی لڑکی ہوں اور یہاں سانپ کی چھتریاں جمع کرنے آئی تھی (لیزا ہاتھہ میں ایک ٹوکری لٹکائے چلی آ رہی تھی) ۔ اور جناب کیا توگی لوو سے آئے ہیں؟» «بالکل ٹھیک! میں چھوٹے سرکار کا ملازم خاص ہوں ۔» الکسی چاہتا تھا کہ وہ اس لڑکی سے برابر کی سماجی حیثیت سے ملے ۔ لیزا اس کی طرف دیکھکر ہنسی اور بولی «اوں ہوں آپ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے، مجھے پتہ ہے کہ آپ خود ہی چھوٹے سرکار ہیں ۔» «یہ تمہیں کیسے پتہ چلا؟» «ہر بات سے ۔» «مگر کس بات سے؟» «واہ کیا نوکر اور مالک میں فرق کرنا مشکل ہے؟ تمہارے کپڑے اور طرح کے ہیں، تمہاری بات چیت جدا ہے اور تم نے کتے کو بلایا تو ہم لوگوں کی طرح نہیں بلایا ۔» الکسی کی نظروں میں لیزا کی دلربائی بڑھتی جا رہی تھی ۔ وہ گاؤں کی چنچل حسیناؤں سے بے تکلفی برتنے کا عادی تھا، چنانچہ اس نے لیزا کی کمر میں ہاتھہ ڈالنا چاہا مگر لیزا اس تیزی سے پیچھے ہٹی اور اس کے چہرے پر اسقدر بے رخی اور رکھائی تھی کہ الکسی حیران رہ گیا ۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھہ کھینچ لیا اور چھیڑ چھاڑ سے باز رہا ۔ «اگر آپ مجھہ سے میل جول بڑھانا چاہتے ہیں» لیزا نے بڑی دیدہ دلیری سے کہا

«تو پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔» «ارے واہ تم تو بڑی وہ نکلیں۔ تمہیں اس طرح بات کرنی کس نے سکھائی؟» اور الکسی ہنسنے لگا «کیا ہماری دوست ناستنکا نے جو تمہاری مالکن کی خادمہ ہے، میں دیکھتا ہوں کہ عورتوں میں تعلیم کا چرچا عام ہو رہا ہے!» لیزا پچھتائی کہ اس نے اپنے پارٹ کے مطابق بات نہیں کی۔ چنانچہ اس نے بات بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا «مجھے ناستیا کیوں سکھاتی؟ کیا میں خود کبھی بڑی حویلی نہیں جاتی؟ وہاں ہر طرح کی بات دیکھتی سنتی ہوں... ارے اگر میں یوں کھڑی کھڑی باتیں کرتی رہی تو سانپ کی چھتریاں جمع ہو لیں! سرکار آپ اب اپنے رستے جائیے اور میں اپنے رستے۔ سلام!» لیزا نے جانے کو قدم بڑھایا تو الکسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور روکتے ہوئے کہا «مجھے اپنا نام تو بتاتی جاؤ سندری!» «اکولینا» لیزا نے اپنی انگلیاں الکسی کے ہاتھ سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ «مجھے جانے دیجئے سرکار، اب گھر لوٹنے کا سمے ہو گیا۔» «اچھا اکولینا میں کسی دن تمہارے ابا سے ملنے آؤنگا۔» «ارے کہیں ایسا نہ کرنا غضب ہی ہو جائیگا۔ اگر گھر میں کسی کو پتہ چل گیا کہ میں کسی صاحب سے اکیلے جنگل میں باتیں کر رہی تھی تو میری شامت آ جائیگی۔ میرے بابا تو مار مار کے میری ہڈی پسلی ایک کر دینگے۔» «پھر تم سے کیسے ملوں؟» «میں پھر سانپ کی چھتریاں اکھٹی کرنے آؤنگی۔» «کب؟» «کیا پتہ کل ہی آجاؤں۔» «اکولینا! اگر کر سکتا تو اسوقت میں تمہیں ضرور پیار کرتا۔ اچھا کل ضرور آنا اسی وقت۔»

«اچھا ــ» «دیکھو مجھے دھوکہ نہ دینا ــ» «نہیں ــ» «اچھا قسم کھاؤ ــ» «پاک صلیب کی قسم ضرور آؤنگی ــ»

اتنا کہہ کر دونوں جدا ہو گئے ــ لیزا جنگل میں سے نکل کر کھیتوں کو پار کرتی ہوئی اپنے باغیچے میں گھس گئی ــ اور وہاں سے سیدھی فارم پہونچی جہاں ناستیا اس کا انتظار کر رہی تھی ــ وہاں پہنچکر کپڑے بدلتے ہوئے اس نے اپنی رازدار کے پرشوق سوالوں کے جواب تو دئے مگر جیسے کچھہ کھوئی کھوئی ہو ــ کپڑے بدلکر جلدی جلدی گھر پہونچی تاکہ وقت پر ڈرائنگ روم میں پہونچ جائے ــ ناشتا میز پر لگ چکا تھا ــ مس جیکسن سویرے سویرے پاؤڈر لگائے کمر پیٹی سے کسے ڈبل روٹی میں سے پتلے پتلے توس کاٹ رہی تھیں ــ لیزا کے باپ نے اس کو سحر خیزی پر بہت شاباشی دی «صحت کے لئے صبح سویرے اٹھہ کر سیر کرنے سے بڑھکر کوئی مفید چیز نہیں ــ» پھر انہوں نے انگریزی رسالوں سے اس کے ثبوت میں ایسی مثالیں سنائیں کہ جتنے لوگ سو سے زیادہ عمر کے ہوتے تھے وہ سب ووڈکا سے پرہیز کرتے تھے اور گرمی ہو یا جاڑا صبح سویرے اٹھتے تھے ــ لیزا نے ان سب باتوں پر ذرا دھیان نہ دیا ــ اس کے دماغ میں ابھی تک سویرے کی رومانی ملاقات کے واقعات گھوم رہے تھے ــ اکولینا اور نوجوان شکاری کی گفتگو کانوں میں گونج رہی تھی ــ مگر اب اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا ــ بہتیرا وہ اپنے کو سمجھاتی کہ اس کے مذاق کا کوئی برا نتیجہ نہیں نکل سکتا، کہ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو شرافت سے گری ہوئی ہو مگر اس کا ضمیر

اسے چین نہ لینے دیتا تھا۔ سب سے زیادہ بےکلی اس بات کی تھی کہ وہ اتنی بڑی قسم کھاکر اگلے دن آنے کا وعدہ کر آئی تھی۔ وہ اپنی قسم توڑ دیتی مگر یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں الکسی اس کا انتظار کرکے سچ مچ لوہار کی لڑکی اکولینا کو ڈھونڈنے گاؤں میں نہ پہونچ جائے اور وہاں اگر اس نے اصلی بھدی موٹی چیچک رو اکولینا کو دیکھ لیا تو لیزا کی دھوکہ بازی کا حال اس پر کھل جائےگا۔ اس خیال سے وہ اتنی گھبرائی کہ اگلے دن پھر اکولینا بن‌کر جنگل کیطرف جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ادھر الکسی پر ابھی تک اس تازہ ملاقات کا سرور چھایا ہوا تھا۔ دن بھر وہ اسی کے دھیان میں مست رہا اور رات کو خواب میں بھی وہی سلونی دل‌کش صورت نظر آتی رہی۔ اگلے دن صبح سویرے پو پھٹنے سے پہلے وہ کپڑے بدل کر تیار ہو گیا۔ بندوق بھرنے کا انتظار کئے بغیر اس نے اپنے وفادار کتے سبوگار کو ساتھ لیا اور جائے ملاقات کی طرف تیزی سے روانہ ہو گیا۔ انتظار کا آدھا گھنٹہ کاٹنا پہاڑ ہو گیا۔ آخر جھاڑیوں میں سے نیلے صرافان کی جھلک دکھائی دی اور وہ اپنی پیاری اکولینا سے ملنے کو لپکا۔ الکسی کے پرجوش شکریہ کے جواب میں اکولینا مسکرائی۔ مگر الکسی نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور افسردگی کے آثار ہیں۔ وجہہ پوچھی تو لیزا نے اقرار کیا کہ اس وقت اس کا یہاں آنا ٹھیک نہیں تھا۔ مگر وہ اپنی قسم پوری کرنے آئی۔ اور یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ آئندہ وہ اس سے ملنے نہ آ سکیگی۔ اس نے الکسی سے یہ بھی کہا کہ ایسی جان پہچان بڑھانے سے دونوں کا کوئی

فائدہ نہیں۔ یہ سب باتیں اس نے دیہاتی لہجے میں کہیں۔ مگر ایک سیدھی سادھی گاؤں کی لڑکی میں یہ احساسات اور جذبات بہت تعجب خیز تھے۔ الکسی بہت حیران ہوا اور اس نے اکولینا کو اس فیصلے سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش کی۔ اس نے اسے اپنے ارادوں کی پاک بازی کا یقین دلایا کہ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرے گا جس پر اکولینا کو شکایت ہو۔ ہر معاملے میں اس کی خواہش پر سر جھکانے کو تیار رہیگا۔ صرف یہ کہ وہ اسے تنہائی میں ملنے کی مسرت سے محروم نہ کرے۔ ہر روز نہ سہی، ہر تیسرے دن یہ بھی نہیں تو ہفتہ میں دو بار ہی سہی۔ اس کی گفتگو میں وفور جذبات کی وجہہ سے زور پیدا ہو گیا تھا اور اس وقت اسے یہی احساس تھا کہ وہ اکولینا سے سچی محبت کرتا ہے۔ لیزا چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی۔ «اچھا مجھہ سے وعدہ کرو» بات ختم ہونے پر اس نے کہا «کہ تم کبھی گاؤں میں جاکر میری جستجو نہ کروگے، نہ میرے بارے میں پوچھہ گچھہ کروگے۔ اور وعدہ کرو کہ سوائے ان موقعوں کے جب میں خود تم سے آکر ملوں مجھہ سے ملنے کی کوشش نہ کروگے۔» الکسی صلیب کی قسم کھاکر وعدہ کرنے کو تیار تھا۔ مگر لیزا نے مسکراکر روک دیا۔ «بس بس مجھے تمہاری قسموں کی ضرورت نہیں۔ تمہاری زبان کا اعتبار ہے۔» اس کے بعد دونوں دیر تک جنگل میں ٹہلتے رہے اور خوب گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ آخرکار لیزا نے کہا «اچھا اب میرے گھر جانے کا وقت ہو گیا۔» وہ جدا ہو گئے۔ الکسی جب اکیلا رہ گیا تو وہ یہ سوچ کر حیران تھا کہ دو ہی ملاقاتوں

میں اسی دیہاتی حسینہ نے اس پر کیا جادو کر دیا۔ اکولینا سے اس کے تعلقات میں دلکش انوکھاپن تھا اور حالانکہ اس عجیب و غریب دیہاتی لڑکی کی شرطیں بہت سخت تھیں پھر بھی انہیں توڑنے کا خیال تک اس کے ذہن میں نہ آیا۔ اصل بات یہ تھی کہ بھیانک انگوٹھی، پراسرار خط اور فریب خوردہ انداز کے باوجود الکسی ایک سادہ دل جذباتی نوجوان تھا اور اس کا معصوم دل سیدھی سادھی خوشیوں میں مگن ہو جاتا تھا۔

اگر مجھے صرف اپنی دلچسپی منظور ہوتی تو یہاں نوجوان جوڑے کی محبت بھری پوشیدہ ملاقاتوں، ان کی روز افزوں پسندیدگی، ان کی رازداریوں، ان کے مشاغل اور ان کی گفتگو کا بہ تفصیل تذکرہ لکھتا۔ مگر جانتا ہوں کہ پڑھنے والوں کو اس میں لطف نہیں آئیگا۔ ایسی تفصیلات کچھ بے مزہ اور بےرنگ سی لگتی ہیں، اس لئے میں ان کا ذکر چھوڑکر بس اتنا کہونگا کہ دو مہینے کے اندر اندر الکسی کو لیزا سے بے پناہ عشق ہو گیا اور لیزا اگرچہ منہ سے نہ کہتی تھی مگر اس کے دل پر بھی محبت رفتہ رفتہ اثر کر رہی تھی۔ دونوں حال میں مست تھے اور مستقبل کے متعلق سوچتے ہی نہ تھے۔

بہت دفعہ ان کے دل میں مستقل اور پائیدار رشتہ قائم کرنے کا خیال گزرا۔ مگر دونوں اس کا ذکر ایک دوسرے سے کرتے ہوئے جھجھکتے تھے۔ اس کی وجہہ سمجھنی کچھہ مشکل نہیں۔ الکسی کو اکولینا سے سچا عشق تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے اور غریب دیہاتی لڑکی کے درمیان عبور

نہ ہو سکنے والے صحرا حائل تھے۔ اور لیزا جانتی تھی کہ اس کے اور الکسی کے باپ میں جو اختلاف چلا آتا تھا اس کے ختم ہونے کی کوئی امید نہیں۔ دوسری طرف اس کا نسوانی پندار اس مبہم رومانی امید سے خوش ہوتا تھا کہ شاید ایک دن توگی‌لوو جاگیر کے وارث کو پری‌لوچنو لوہار کی لڑکی کے سامنے جھکنا پڑے۔ اور پھر ایک دن واقعات نے ایسا پلٹا کھایا جس سے ان دونوں کی حیثیت ایک دوسرے کی نظر میں بدل جانے کا امکان تھا۔

خزاں کی ایک خنک اور خوشگوار صبح کو اور ہماری روسی خزاں میں ایسی صبحوں کی کمی نہیں ایوان پتروویچ بیرستوف سواری کے لئے گھر سے نکلے۔ چلتے ہوئے احتیاطاً پانچ چھہ شکاری کتے، اپنے سائیس اور کسانوں کے کچھہ لڑکے جن کے پاس نقارے تھے ساتھہ لے لئے۔ عین اسی وقت اچھا موسم دیکھکر گریگوری ایوانووچ مورومسکی نے بھی گھوڑی کسنے کا حکم دیا اور اپنی انگریزی طرز کی جاگیر کا دورہ کرنے چل دئے۔ جب وہ جنگل کے نزدیک پہونچے تو انہوں نے اپنے پڑوسی کو نہایت طمطراق کے ساتھہ گھوڑے پر سوار دیکھا۔ وہ اس وقت لومڑی کے کھال کی صدری پہنے ایک خرگوش کی تاک میں تھے جسے کسان لڑکے شور مچا مچاکر جھاڑیوں میں سے کھدیڑ رہے تھے۔ اگر گریگوری ایوانووچ کو اس مڈبھیڑ کا پہلے سے خطرہ ہوتا تو وہ یقیناً اپنا رخ دوسری طرف پھیر لیتے۔ مگر بیرستوف سے ان کا آمنا سامنا اسقدر اچانک ہوا جب وہ ایک دوسرے سے صرف ایک گولی

فاصلے پر رہ گئے تھے۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ یورپ کے شہری اخلاقی اصولوں کے ماتحت موروسکی اپنے حریف کی طرف بڑھا اور اخلاق کے ساتھہ اس سے علیک سلیک کی۔ اس کا جواب بیرستوف نے اتنی گرم جوشی سے دیا جیسے کوئی رسی میں بندھا ہوا بھالو اپنے آقا کی زبردستی سے امرا کو سلام کرے۔ عین اسی وقت خرگوش جنگل میں سے چھلانگ لگاکر برقی سرعت کے ساتھہ کھیتوں کی طرف ہو لیا۔ بیرستوف اور اس کے سائیس نے پوری طاقت سے شور مچانا شروع کیا، کتوں کو چھوڑ دیا اور خود خرگوش کے تعاقب میں گھوڑے ڈال دئے۔ موروسکی کی گھوڑی جو کبھی شکار کے لئے استعمال نہ ہوئی تھی اس شور و غل پر بدکنے لگی۔ موروسکی نے جو اپنے کو بڑا شہسوار سمجھتا تھا لگام میں ڈھیل دیدی اور خوش تھا کہ اسے اس ناخوشگوار مڈبھیڑ سے جلدی نجات مل گئی۔ مگر اس کی گھوڑی ایک کھائی کے کنارے پہونچکر جو اسے پہلے نظر نہیں آئی تھی، الف ہو گئی۔ موروسکی گھوڑی کی پشت سے یخ بستہ زمین پر بری طرح گرا۔ اور اپنی دم کٹی گھوڑی کو بےنقط سنانے لگا جو اپنے سوار کو گراتے ہی ٹھہر گئی تھی۔ ایوان پتروویچ گھوڑا دوڑاکر وہاں پہونچا اور گریگوری ایوانوویچ سے خیریت پوچھنے لگا۔ اتنے میں اس کا سائیس مجرم گھوڑی کو لگام پکڑے وہاں لے آیا۔ اس نے موروسکی کو سہارا دیکر گھوڑے پر سوار کیا۔ بیرستوف نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور موروسکی نے مجبوراً قبول کر لی۔ اور یوں بیرستوف فتحیاب اپنے گھر لوٹا کہ

زخمی دشمن اور ایک خرگوش انعام فتح کے طور پر ساتھ تھا۔

گھر پہنچ کر دونوں پڑوسیوں میں دوستانہ بات چیت ہونے لگی۔ موروسکی نے ناشتہ وہیں کیا اور بیرستوف سے اس کی گاڑی مانگی کیونکہ اس واقعہ کے بعد اس کے اعصاب اس قابل نہ تھے کہ اسی گھوڑی پر واپس اپنے ہاں جا سکے۔ بیرستوف اسے چھوڑنے دروازے تک آیا۔ جاتے جاتے موروسکی نے بیرستوف سے وعدہ لے لیا کہ وہ اگلے دن الکسی ایوانووچ کے ہمراہ اس کے ہاں ایک دوست کی طرح کھانا کھانے ضرور آئیگا اور یوں یہ پرانی دشمنی ایک دم کٹی گھوڑی کی بزدلی کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

لیزا دوڑتی ہوئی گریگوری ایوانووچ کو لینے آئی۔ «کیا ہوا پاپا؟» اس نے حیرت سے پوچھا۔ «آپ لنگڑا کیوں رہے ہیں؟ آپ کی گھوڑی کہاں ہے؟ اور یہ گاڑی کس کی ہے؟» «مائی ڈیر تم ہرگز بوجھ نہیں سکتیں کہ یہ کس کی گاڑی ہے» گریگوری ایوانووچ کو انگریزی طرز خطاب بہت پسند تھا۔ انہوں نے پورا قصہ بہت تفصیل سے لیزا کو سنایا۔ لیزا کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ابھی وہ اس حیرت ناک خبر سے سنبھلی نہ تھی کہ گریگوری ایوانووچ نے بتایا کہ بیرستوف اور اس کا بیٹا اگلے دن ان کے ہاں کھانے پر مدعو ہیں۔ «ہیں؟ کیا سچ مچ؟» لیزا کا رنگ اڑ گیا۔ «بیرستوف باپ اور بیٹا دونوں کل ہمارے ہاں کھانے پر آئینگے؟ پاپا آپ چاہے جو کہیں میں ہرگز ان لوگوں کے سامنے نہ آؤنگی۔» «کیا

پاگل ہوئی ہو؟ ایسی شرمیلی کب سے ہو گئیں؟ یا ناول کی ہیروئینوں کی طرح خاندانی دشمنی تم میں سرائت کر گئی ہے؟ مجھے اس قسم کی لغویات بالکل پسند نہیں۔» «نہیں پاپا، ہرگز نہیں، چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میں بیرستوف کے سامنے ہرگز نہ آؤنگی۔» گریگوری ایوانووچ اچھی طرح جانتے تھے کہ لیزا کی مخالفت کرنا بیکار ہے۔ اسلئے وہ سر ہلاتے ہوئے یہ بحث چھوڑکر اس دن کی یادگار سیر کے بعد آرام کرنے چلے گئے۔

لیزاویتا گریگوریونا اپنے کمرے میں گئی اور ناستیا کو بلایا۔ دونوں نے اگلے دن آنے والے مہمانوں کے سلسلے میں ایک لمبی کانفرنس کی۔ مسئلہ یہ تھا کہ الکسی جب یہ دیکھےگا کہ نوجوان خاتون اور اسکی اکولینا ایک ہی ہیں تو وہ اپنے دل میں لیزا کے اخلاق و عادات، اس کی عفت مآبی اور اس کے اصولوں کے متعلق کیا سوچیگا۔ ساتھ ہی لیزا کا دل یہ بھی چاہتا تھا کہ اس اچانک ملاقات سے الکسی پر جو تاثرات ہوں وہ معلوم کر سکے۔ آخر اس کو ایک ترکیب سوجھی جو اس نے فوراً ناستیا کو بتا دی۔ دونوں بہت خوش تھیں اور چاہے کچھ ہو اپنی تجویز پر عمل در آمد کرنے کی ٹھان لی۔

اگلے دن گریگوری ایوانووچ نے اپنی بیٹی سے پوچھا کہ کیا وہ بیرستوف کے سامنے نہ آنے کے ارادہ پر قائم ہے۔ «پاپا! اگر آپ کی خواہش ہے تو میں ان سے ملنے کو تیار ہوں۔ مگر ایک شرط پر اور وہ یہ کہ چاہے میں جس بھیس میں ان لوگوں کے سامنے آؤں اور چاہے جو کچھ کروں آپ

مجھے ڈانٹیں گے نہیں۔ اور نہ ان لوگوں کے سامنے ناراضگی یا حیرت کا اظہار کرینگے۔» «پھر کچھ شرارت سوجھی ہے» گریگوری ایوانووچ نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔ «اچھی بات ہے میں راضی ہوں جیسی تمہاری مرضی میری آ ہوچشم پگلی بیٹی۔» یہ کہتے ہوئے اس نے لیزا کی پیشانی چومی اور وہ تیاریاں کرنے بھاگ گئی۔

ٹھیک دو بجے ایک گھریلو قسم کی گاڑی جس میں چھہ گھوڑے جتے ہوئے تھے موروسکی کے دروازے میں داخل ہوئی اور سبز سبز دوب کے دائرے سے گزر کر برساتی میں کھڑی ہو گئی۔ موروسکی کے دو باوردی چو بداروں نے بیرستوف کو اعزاز کے ساتھہ اتارا۔ بیٹا پیچھے پیچھے گھوڑے پر سوار تھا۔ دونوں باپ بیٹے کھانے کے کمرے میں پہونچے جہاں کھانے کی میز لگی ہوئی تھی۔ موروسکی اپنے مہمانوں کے ساتھہ بہت تواضع اور اخلاق کے ساتھہ پیش آیا۔ بجری بچھے ہوئے صاف ستھرے راستوں پر سے گزرکر وہ ان کو اپنا باغ اور چڑیاخانہ دکھانے لے گیا جنہیں دیکھکر بیرستوف دل ہی دل میں ناخوش ہو رہا تھا کہ نہ جانے کتنی محنت اور وقت اس قسم کے فضول شوق میں ضائع ہوا ہوگا مگر اخلاقاً منہ سے کچھہ نہ کہا۔ اس کا بیٹا نہ تو اپنے کفایت شعار باپ کی طرح ناخوش تھا اور نہ اپنے انگریزپرست میزبان کی طرح ان چیزوں کا پر جوش مداح۔ وہ اس وقت نہایت اشتیاق سے میزبان کی بیٹی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا جس کے متعلق اس نے بہت کچھہ سن رکھا تھا۔ اور گو وہ اپنا دل اکولینا کو دے چکا

تھا پھر بھی ایک نوجوان حسین لڑکی کا خیال اس کے تخیل میں ہیجان پیدا کر رہا تھا۔

تینوں کے تینوں واپس آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ دونوں بوڑھے پرانے وقتوں کو یاد کرنے لگے۔ اور اپنی اپنی فوجی زندگی کے قصے سنانے لگے۔ الکسی سوچ رہا تھا کہ لیزا کے سامنے وہ کیا انداز اختیار کرے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ تغافل آمیز بے اعتنائی کا رویہ سب سے مناسب رہیگا۔ دروازہ کھلا، اس نے نہایت توہین آمیز بے نیازی کے ساتھ منہ موڑ کر اس طرح دیکھا کہ شوخ سے شوخ سنگدل حسینہ کا دل بھی ایک بار دھڑکنے لگتا۔ مگر بدقسمتی سے یہ لیزا نہیں مس جیکسن تھی جو پیٹی سے کمر کسے پاؤڈر لگائے نگاہیں جھکائے کمرے میں داخل ہوئیں اور مہمانوں کے سامنے ناز و انداز سے سلام کر کے بیٹھ گئیں۔ بیچارے الکسی کی معرکہ خیز تیاری اکارت گئی۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھلنے نہ پایا تھا کہ دروازہ پھر کھلا، اور لیزا کمرے میں داخل ہوئی۔ سب کھڑے ہو گئے، باپ مہمانوں کا تعارف کرانا چاہتا تھا کہ ایکدم چپ ہوکر ہونٹ کاٹنے لگا۔ لیزا، اس کی سلونی بیٹی لیزا کانوں تک پاؤڈر سے سفید ہو رہی تھی گویا مس جیکسن کا مقابلہ کرنے آئی ہو۔ لوئی چہار دہم کی طرح مصنوعی بالوں کی گھونگھریالی لٹیں جو اس کے اصلی بالوں سے بہت ہلکے رنگ کی تھی شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ چوڑی چوڑی خبطیوں جیسی آستینیں جیسے مادام پامپودور کے سائے کی ہوں۔ کمر لیس سے اسقدر کس کر باندھی تھی کہ جسم کی وضع انگریزی حرف «اکس» جیسی ہو

گئی تھی۔ ماں کے وہ ہیرے جواہرات جو رہن ہونے سے بچ رہے تھے انگلیوں، گلے اور کانوں میں چمک رہے تھے۔ الکسی اس بھڑکیلی مضحکہ خیز لڑکی میں اپنے اکولینا کو نہ پہچان سکا۔ باپ نے اور پھر اس کی دیکھا دیکھی بیٹے نے مجبوراً لیزا کے ہاتھ کو ہونٹوں سے چھوا تو الکسی نے لیزا کی نازک انگلیوں میں کچھ ارتعاش سا محسوس کیا۔ اور عین اسی وقت ایک چھوٹے سے حسین پاؤں کی جھلک دیکھی جو شاید انتہائی دلکش جوتیوں کی نمائش کرنے کے لئے سامنے نظر آ رہے تھے۔ پاؤں دیکھکر الکسی کے ذوق حسن کو کچھ تسکین ملی، اور اس نے لیزا کے لباس کی بدمذاقی کو کسی حد تک بخش دیا۔ رہی پاؤڈر سرخی تو وہ اس معاملے میں اتنا ناتجربہ کار اور معصوم تھا کہ شروع میں تو اس نے دیکھا ہی نہیں اور بعد میں بھی اسے یہ شبہ نہیں گزرا کہ لیزا اتنا پاؤڈر تھوپے ہوئے ہے۔ گریگوری ایوانووچ اپنا وعدہ نبھانے کے لئے خاموش رہے۔ انہوں نے اپنے چہرے سے حیرت کا اظہار نہ ہونے دیا۔ مگر ان کو اپنی بیٹی کی شرارت پر اتنی ہنسی آ رہی تھی کہ سنجیدہ چہرہ بنائے رکھنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ دوسری طرف محتاط انگریز عورت دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہ فوراً سمجھ گئی تھی کہ پاؤڈر سرخی اسی کی ڈریسنگ ٹیبل سے اڑائی گئی ہے۔ پاؤڈر لگے ہوئے چہرے کی مصنوعی سفیدی کے نیچے اس کا رنگ غصے سے عنابی ہو گیا۔ اس نے نوجوان مازمہ کی طرف غصے بھری نگاہ سے دیکھا۔ لیزا نے

ظاہر کیا گویا وہ ان کا مطلب سمجھی ہی نہیں۔ جانتی تھی کہ بعد میں تو جواب دہی کرنی ہی ہوگی۔

سب لوگ میز کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ الکسی سوچ میں ڈوبے ہوئے بےخیال نوجوان کا پارٹ کھیلتا رہا۔ لیزا بناوٹ سے مسکراتی رہی، وہ دانت بھینچ کر گنگناتی ہوئی آواز میں صرف فرنچ میں بات کر رہی تھی۔ اس کا باپ باربار اس کی طرف دیکھتا تھا۔ اگرچہ یہ بھید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر وہ اپنی بیٹی کی شرارت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ انگریز عورت غصے کے مارے گونگی ہو گئی تھی۔ صرف ایوان پتروویچ ان سب معاملات سے بےخبر بڑے مزے میں تھے، انہوں نے تقریباً دو آدمیوں کے برابر کھانا کھایا۔ دل بھرکر شراب پی اور خود اپنے مذاقوں پر ہنستے رہے۔

آخر میز پر سے اٹھنے کا وقت ہو گیا۔ مہمان رخصت ہوئے، پہلے تو گریگوری ایوانووچ دل بھر کر ہنستے رہے، پھر لیزا سے پوچھا «آخر تم نے ان لوگوں کو کیوں بیوقوف بنایا؟ اور ایک بات اور یہ ہے کہ پاؤڈر تمہارے بہت اچھا لگتا ہے، میں عورتوں کے بناؤ سنگھار کے معاملے میں کچھ نہیں جانتا، پھر بھی میں اگر تمہاری جگہ ہوتا تو آج ہی سے پاؤڈر کا استعمال شروع کر دیتا۔ زیادہ نہیں بس تھوڑا تھوڑا۔» لیزا اپنی کامیابی پر بہت خوش تھی۔ مارے خوشی کے باپ کے گلے سے لپٹ گئی اور وعدہ کیا کہ ان کی پاؤڈر والی صلاح پر غور کریگی۔ پھر وہ ناراض مس جیکسن سے معذرت کرنے گئی۔ انہوں نے مارے غصے کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر

لیا تھا اور اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھیں۔ باہر ہی سے لیزا نے کہا کہ اجنبی لوگوں کے سامنے اپنا سانولا رنگ دکھاتے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی۔ مگر ان سے پاؤڈر مانگنے کی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی، اسی لئے اسے یقین ہے کہ عزیز مس جیکسن اس کی اس گستاخی کو ضرور معاف کر دینگی وغیرہ وغیرہ۔ جب مس جیکسن کو یقین ہو گیا کہ لیزا کا ارادہ ان کا مذاق اڑانے کا نہیں تھا تو کچھ ٹھنڈی پڑیں، لیزا کو پیار کیا اور اپنی خوشنودی کے ثبوت میں انگریزی کریم کا ایک مرتبان اسے دیا جسے لیزا نے پرخلوص شکریہ کے ساتھہ قبول کر لیا۔

ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگلے دن لیزا کس قدر بےچینی کے ساتھہ الکسی سے ملاقات کرنے پہونچی ہوگی۔ «کل آپ سرکار کے گھر گئے تھے؟» لیزا نے الکسی سے ملتے ہی پوچھا۔ «آپ کو کیسی لگیں ہماری بٹیا سرکار؟» الکسی نے جواب دیا «میں نے تو اچھی طرح دیکھا نہیں۔» «چہ! چہ!» لیزا نے افسوس ظاہر کرتے ہو کہا۔ «کیوں؟» الکسی نے پوچھا۔ «اس لئے کہ میں تم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ لوگ جو کچھہ کہتے ہیں کیا وہ ٹھیک ہے؟» «لوگ کیا کہتے ہیں؟» «لوگ کہتے ہیں... کہ... کہ... میری صورت ان سے ملتی ہے!» «بالکل بکواس کہاں تم اور کہاں وہ! وہ تو بہت عجیب صورت کی ہے۔» «توبہ، توبہ، آپ بھی کیا بات کرتے ہیں، وہ تو اتنی گوری، اتنی خوب صورت، اتنی فیشن‌ایبل ہیں۔ بھلا میرا اور ان کا کیا مقابلہ۔» الکسی نے قسم کھا کر کہا کہ وہ دنیا بھر کی گوری

چٹی لڑکیوں سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ اسے اور بھی یقین دلانے کو اس نے اس کی آقازادی کا ایسا مضحکہ خیز نقشہ کھینچا کہ لیزا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ «پھر بھی» اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ «ممکن ہے کہ بٹیا سرکار ایسی ہی ہنسی کے قابل ہوں جیسا آپ کہتے ہیں۔ مگر میں تو بالکل جاہل گنوار ہوں ان کے مقابلے میں، نہ پڑھی نہ لکھی۔» الکسی نے کہا «اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا تمہیں یہی فکر ہے؟ اگر تم چاہو تو میں تمہیں ابھی پڑھانا شروع کر دوں۔» «سچ مچ» لیزا نے بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ «کوشش تو کر دیکھوں۔» «ہاں ضرور! لاؤ ابھی شروع کر دیں۔» دونوں بیٹھ گئے۔ الکسی نے جیب سے پنسل اور نوٹ بک نکالی اور اکولینا کو حرف تہجی بتائے جو اس نے بہت ہی تھوڑی دیر میں پہچان لئے۔ الکسی اس تیزی پر حیران رہ گیا۔ اگلے دن اس نے لکھنا سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ شروع شروع میں تو وہ اناڑیوں کی طرح پنسل پکڑتی رہی۔ مگر کچھ دیر بعد خاصے اچھے حروف بنانے لگی۔ «حد ہے» الکسی نے کہا۔ «کہتے ہیں کہ لنکاسٹر سسٹم کے ذریعہ بہت جلدی لکھنا پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔ مگر تم تو اس سے بھی زیادہ تیزی سے سیکھ رہی ہو۔» تیسرے روز اکولینا اس قابل ہو گئی کہ اس نے ہجے کر کے اتنا پڑھ لیا «نتالیا، بیار کی بیٹی»، بیچ بیچ میں وہ ایسی رائے زنی بھی کرتی جاتی تھی جس پر الکسی کو انتہائی تعجب تھا۔ پھر اسنے ایک پورے صفحے پر اسی ناول میں سے محاورے نقل کر ڈالے۔

یوں ہی ایک ہفتہ اور گزر گیا، اب دونوں میں باقاعدہ خط و کتابت ہونے لگی۔ ان کا پوسٹ آفس ایک قدیم بلوط کے درخت کی کھوکھ تھی۔ ناستیا پوشیدہ طور پر ڈاکیہ کی خدمات انجام دے رہی تھی۔ الکسی بڑے بڑے حرفوں میں لکھے ہوئے خط بلوط کی کھوکھ میں آکر ڈال جاتا، اور وہاں اسکو سستے نیلے کاغذ پر اپنی محبوبہ کے ہاتھ کا تیڑھے میڑھے حروف میں لکھا ہوا خط ملتا۔ مگر اکولینا کا انداز تحریر دن بدن بہتر ہوتا گیا اور لگتا تھا کہ اس کا ذہن بھی بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

اسی دوران میں ایوان پتروویچ بیرستوف اور گریگوری ایوانووچ موروسکی میں جو نئے تعلقات قائم ہوئے تھے دن بدن زیادہ استوار ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ موروسکی اکثر سوچتا کہ ایوان پتروویچ کے بعد اس کی ساری جائیداد الکسی ایوانووچ کو ملےگی اور ایک دن وہ اس علاقہ کا سب سے بڑا جاگیردار ہوگا۔ کیوں نہ وہ اس سے اپنی لیزا کی شادی کر دے۔ دوسری طرف بوڑھے بیرستوف نے اپنے دل میں سوچا کہ مان لیا اس کا پڑوسی کچھ خبطی سا ہے (مثلاً اسکو ہر انگریزی چیز کا جنون ہے)۔ لیکن اس میں بعض خوبیاں بھی تھیں۔ مثلاً غیرمعمولی اپج، پھر یہ کہ وہ کاؤنٹ پرونسکی کا قریبی عزیز تھا، جو ایک ممتاز اور بارسوخ آدمی تھا۔ اور کاؤنٹ کی وجہ سے الکسی کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اور موروسکی (بیرستوف نے سوچا) میرے لڑکے سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے میں فائدہ سمجھیگا۔ کچھ عرصہ تک دونوں بوڑھے الگ الگ

یہی ایک بات سوچتے رہے، لیکن آخر ایکدن دونوں نے اپنے دل کی بات ایک دوسرے کو بتا دی، دونوں گلے ملے اور وعدے وعید ہو گئے کہ اس معاملے پر پوری طرح غور کرینگے۔ دونوں نے اپنے اپنے طور پر اس مہم کو شروع کیا۔ موروسکی ذرا فکرمند تھا کیونکہ اس کی بیٹسی اور الکسی اس دن کی یادگار کی دعوت کے بعد ایک دوسرے سے نہیں ملے تھے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ وہ ایک دوسرے کی طرف کچھہ راغب نہیں۔ کیونکہ اس دن کے بعد الکسی پھر کبھی پری‌لوچنو نہ آیا، اور جب کبھی ایوان پتروویچ ان کے ہاں آتے تو لیزا فوراً اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ مگر گریگوری ایوانووچ نے سوچا کہ اگر الکسی روزانہ یہاں آئے تو بیٹسی کو یقیناً اس سے عشق ہو جائیگا۔ کیونکہ یہ قدرتی بات ہے بس وقت چاہئے۔

ایوان پتروویچ کو اپنی تجویز کی کامیابی کا زیادہ یقین تھا، چنانچہ انہوں نے اسی دن اپنے بیٹے کو مطالعے کے کمرے میں بلایا، پائپ سلگا کر تھوڑے سے وقفے کے بعد کہا «کیوں الکسی! کیا بات ہے پچھلے دنوں سے تم نے فوج میں جانے کا ذکر چھوڑ دیا، کیا اب تمہیں فوجی وردی پہننے کی بالکل آرزو نہیں رہی؟» «جناب» الکسی نے بڑے ادب سے جواب دیا «کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ میرا فوج میں جانا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ آپ کے حکم کے سامنے سر جھکا دوں۔» «یہ تو بہت سعادتمندی کی بات ہے» ایوان پتروویچ نے کہا۔ «آج مجھے یقین ہو گیا کہ تم نہایت فرمانبردار بیٹے

ہو اور مجھے اس خیال سے بڑی مسرت ہوئی۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ تمہاری مرضی کے خلاف تمہیں گورنمنٹ سروس میں بھیجنے پر اصرار کروں... اسلئے فی الحال میں یہ چاہتا ہوں کہ تم شادی کر لو۔»

«آپ کس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں جناب؟» الکسی نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔

«لیزاویتا گریگوریونا مورومسکایا سے» ایوان پتروویچ نے جواب دیا۔ «وہ اچھا انتخاب ہے نا؟»

«مگر ابا جان میرا تو فی الحال شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔»

«تمہیں خیال نہیں ہے اسی لئے تو مجھے خیال کرنا پڑا۔»

«مگر جناب مجھے تو لیزا مورومسکایا بالکل پسند ہی نہیں ہے۔»

«اسوقت پسند نہیں ہے تو شادی کے بعد پسند ہو جائےگی، سب عادت کی بات ہے۔»

«مجھ سے شادی کر کے وہ خوش نہیں رہ سکتی۔»

«خیر اس کی خوشی کی پروا نہ کرو... مگر اس کا مطلب؟ کیا تمہیں اپنے باپ کی خواہشات کا اتنا ہی پاس ہے؟ شرم کرو۔»

«آپ چاہے جو کہیں میں شادی کرنا نہیں چاہتا، اور کسی صورت میں اس پر راضی نہیں ہو سکتا۔»

«تمہیں راضی ہونا پڑیگا۔ ورنہ یاد رکھو تم میری بددعاؤں سے بچ نہ سکوگے، اور قسم ہے پروردگار کی کہ میں ساری

جائیداد بیچ کھوچ کر سب روپیہ اڑا دونگا، اور تمہارے لئے ایک کوپک بھی نہ چھوڑونگا۔ میں تمہیں تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ جاؤ! اور تین دنوں تک میری نظروں سے دور رہو۔»

الکسی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے باپ کے دل میں کوئی بات بیٹھ جائے تو اسکو بقول تاراس سکوتی‌نن (۱۳) کیل سے ٹھوک‌کر بھی باہر نہیں نکالا جا سکتا۔ مگر الکسی بھی اپنے باپ کا بیٹا تھا۔ وہ بھی اپنی بات سے ہٹنےوالا نہیں تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہاں جاکر والدین کی سخت گیری، لیزاویتا گریگوریونا کی شخصیت اور باپ کی اس دھمکی پر کہ وہ اسے قلاش فقیر بنا دیگا غور کرنے لگا۔ آخر میں اس کے خیالات اکولینا پر مرکوز ہو گئے۔ اور پہلی دفعہ اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس سے انتہائی عشق کرتا تھا۔ ایک غریب دیہاتی لڑکی سے شادی کرکے اپنی محنت مزدوری کی کمائی پر زندگی بسر کرنے کا خیال اسے نہایت رومانی معلوم ہوا، جتنا زیادہ وہ اس منصوبے پر غور کرتا اتنا ہی اسے یہ خیال صحیح معلوم ہوتا۔ کچھ دن سے جنگل میں ہونےوالی ملاقاتیں بارشوں کی وجہہ سے رکی ہوئی تھیں۔ اس نے اکولینا کے نام ایک خط لکھا، جس میں بہت صاف صاف مگر انتہائی پریشانی کے لہجے میں ان واقعات کی اطلاع تھی۔ آخر میں اس نے اکولینا سے شادی کی درخواست کی تھی۔ وہ اس خط کو کھوکھلے بلوط کے درخت میں ڈال آیا اور مطمئن ہوکر سو گیا۔

اگلے دن وہ صبح سویرے موروسکی کے ہاں گیا تاکہ ان سے صاف صاف بات کر سکے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ موروسکی کی فطری فیاضی کو متاثر کرکے انہیں اپنا طرفدار بنا لیگا۔ «کیا گریگوری ایوانووچ گھر پر ہیں؟» اس نے پری‌لوچنو میں کوٹھی کی برساتی کے سامنے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے پوچھا۔ «جی نہیں حضور» نوکر نے جواب دیا۔ «گریگوری ایوانووچ صبح سویرے ہی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔» «یہ تو بڑی بری بات ہوئی» اس نے سوچا۔ «اچھا کیا لیزاویتا گریگوریونا گھر پر ہیں؟» «جی ہاں۔» الکسی گھوڑے پر سے کودا اور اس کی لگام نوکر کو پکڑاکر بغیر اطلاع بھجوائے اندر چلا گیا۔

«سب فیصلہ ابھی ہو جائیگا» اس نے ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔ «میں خود ان صاحبہ ہی سے بات چیت کر لونگا۔» وہ کمرے میں داخل ہوا اور کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ کیونکہ لیزا... نہیں، اکولینا... اس کی پیاری زیتونی رنگ‌والی اکولینا نیلے صرافان کی جگہہ سفید لباس میں کھڑکی کے پاس بیٹھی اس کا خط پڑھ رہی تھی۔ اور اتنی محو تھی کہ اس نے الکسی کے آنے کی چاپ تک نہیں سنی۔ الکسی کے منہ سے خوشی کے مارے چیخ نکل گئی۔ لیزا نے چونک کر سر اٹھایا اور چیخ مارکر بھاگنا چاہتی تھی کہ الکسی نے زبردستی روک لیا۔ «اکولینا! اکولینا۔» لیزا اپنے کو چھڑاکر بھاگنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور فرنچ میں کہے جا رہی تھی۔ «کیا آپ پاگل ہو گئے ہیں جناب! میں تو میں ہوں...» «اکولینا! اکولینا میری

جان» وہ برابر کہے جا رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھوں کو بیساختہ چوم رہا تھا۔ مس جیکسن جو یہ سین دیکھ رہی تھیں، بدحواس تھیں کہ کیا کریں کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور گریگوری ایوانووچ داخل ہوئے۔

«اوہو!» انہوں نے خوش ہوکر کہا «اچھا تو معاملہ آپ لوگوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔»

ناظرین اب مجھے کہانی کا انجام بیان کرنے کے فضول کام سے معاف فرمائیں۔

نوٹ

۱۔ اٹھارھویں صدی کے مشہور روسی ڈرامہ نگار اور صحافی دنیس فونویزن کا ایک طربیہ ڈرامہ، جو ۱۷۸۲ء میں شائع ہوا۔

۲۔ «بال» ـــ پشکن کے دوست یفگنی باراتینسکی کی تخلیق۔

۳۔ بیستوژیف مارلینسکی کی کہانی، جنہوں نے ۱۸۲۵ء کی ۱٤ دسمبر والی بغاوت میں سرگرم حصہ لیا۔ زارشاہی سخت‌گیری کی بدولت پشکن کو مصنف کا نام حذف کرنا پڑا۔ بہرحال ان کی تصنیف کا حوالہ دے کر پشکن نے چپکے سے، دسمبریوں سے اپنی ہمدردیوں کا اظہار کر دیا۔

٤۔ شاعر اور ادیب دنیس داویدوف جو فوجی موضوع پر لکھتے تھے اور پشکن کے دوست تھے۔ ۱۸۱۲ء میں انہوں نے ایک دستے کی قیادت کی اور کسان رضاکاروں کے تعاون کے ساتھ فرانسیسی حملہ آوروں کے خلاف سرفروشی سے جنگ کی۔ بورتسوف نے ۱۸۱۲ء کی حب‌الوطنی کی جنگ میں حصہ لیا، دنیس داویدوف باربار اپنی نظموں میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔

۵۔ روسی جنرل الیکساندر اپسلانتی ـــ ۱۸۲۰ء میں وہ اس خفیہ انقلابی انجمن کے رہنماؤں میں سے تھے جو یونان کو ترکی حملہ‌آوروں سے آزادی دلانے کے لئے قائم ہوئی تھی۔ ۲۹ جون ۱۸۲۱ء کو، دریائے پروت کے کنارے، گاؤں اسکولیانی میں اپسلانتی کی فوجوں کو ترکی فوجوں نے شکست دی۔

٦۔ یہ الفاظ روسی شاعر اور مترجم واسیلی ژوکوفسکی کی نظم «سویتلانہ» سے لئے گئے ہیں۔

۷۔ انیسویں صدی کے روسی ڈرامہ نگار، شاعر اور سیاستدان الیکسانڈر گریبوئیدوف کے مشہور طربیہ ڈرامہ «مذاق بری بلا ہے۔» پشکن کے ہمعصر کا لکھا ہوا یہ طربیہ ڈرامہ، خود پشکن کی انقلابی نظموں کی طرح دسمبری دور کی ممتاز تخلیقات میں سے ہے۔

۸۔ ۱۸ ویں صدی کے ممتاز روسی شاعر، گاوریل درژاوین کی نظم «آبشار»۔

۹۔ یہ اشارہ ہے ۱۹ ویں صدی کے مصنف الکسی پیرووسکی (جن کا قلمی نام انتونی پوگوریلسکی تھا) کے ناول کے مرکزی کردار کی طرف۔

۱۰۔ انیسویں صدی کے شاعر پیوتر ویازیمسکی کی نظم «اسٹیشن» کا ایک ٹکڑا۔

۱۱۔ ترینتیچ—۱۸ ویں صدی کے روسی شاعر ایوان دمیترئیف کی «ہجو» میں ایک گھریلو غلام کا کردار۔

۱۲۔ «جاناں»—اٹھارھویں صدی کے روسی شاعر ایپولیت بوگدانووچ کی نظم۔

۱۳۔ فونویزن کے طربیہ ڈرامہ «کندذہن» کا ایک کردار— ایک مثالی زمیندار اور غلاموں کے مالک کا فرسودہ خیال اور جاہل کردار۔